اس صنف کے بارہ میں کوئی مفصل کام نہیں ہوا تھا، ڈاکٹر نارنگ صاحب نے بڑی خوش سلیقگی سے اردو کی مشہور مثنویوں کے محرکات، ماخذ اور ان کے قصوں کے مندرجات کی تفصیل پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ان مثنویوں کا نہ صرف ایک ادبی مقام ہے بلکہ ان سے اخذ و قبول، قوموں کے اختلاط و اشتراک اور تہذیب و تمدن کے بناؤ سنگار کا بھی علم ہوتا ہے، ان مثنویوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمان شعرا نے اسلامی قصوں کی روایات کے ساتھ ہندوستانی کہانیوں کو بھی قبول کرنے اور ان کو اردو کا جامہ پہنانے میں کبھی بھی بخل سے کام نہیں لیا، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بہت سی ہندوستانی کہانیاں انہی مثنویوں کے ذریعہ زندہ ہوئیں، اس کتاب سے اردو کے تحقیقی و تاریخی ذخیرہ میں ایک عمدہ اضافہ ہوا ہے جس کے لیے ڈاکٹر صاحب موصوف اور مکتبہ جامعہ دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں، دلی یونیورسٹی کا شعبۂ اردو بھی قابلِ ستائش ہے کہ اس کے متوسلین کی وجہ سے اردو زبان کے سلسلہ میں دلی کی قدیم روایت قائم ہے،

موجِ نسیم - از اختر مسلمی، ضخامت ۱۱۲، کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت: عہ - پتے:
(۱) اختر مسلمی، پھول پور، اعظم گڈھ (۲) نصیر الحق شمیم بک ڈپو، سرائمیر، اعظم گڈھ۔

یہ ایک نوجوان شاعر اختر مسلمی کی غزلیات کا مجموعہ ہے، جو موجودہ دور کے نوجوان شعرا میں غزل گوئی کا ستھرا مذاق رکھتے ہیں، ان کے کلام میں تغزل کی تمام خوبیاں ہیں، انھوں نے طویل بحروں میں بھی غزلیں کہی ہیں اور متوسط اور چھوٹی بحروں میں بھی، قافیہ کے لیے انھوں نے آسان زمینیں بھی اختیار کی ہیں اور سنگلاخ زمینوں میں بھی اشہبِ قلم کو دوڑایا ہے، اور ہر میدان میں کامیاب ہوئے ہیں، خاص طور پر چھوٹی بحروں کی بعض غزلوں میں تو بقول آزاد تلوار کی تیزی اور نشتر کی آبداری موجود ہے، انھوں نے جو سیاسی غزلیں کہی ہیں، وہ سیاسی غزل گوئی کا اچھا نمونہ ہیں، ان میں انھوں نے "در حدیث دیگراں" ہندوستان کے مظلوموں کے جذبات و خیالات کی بڑی عمدہ ترجمانی کی ہے، ان سب غزلوں میں زبان و بیان کی خوبیاں موجود ہیں، امید ہے کہ یہ مجموعہ ہر طبقہ میں مقبول ہوگا۔

"م، ج"

جلد ۹۰ - ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۲ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۶۲ء - عدد ۳

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۱۶۲ - ۱۶۴

مقالات

ہندوستان کے سلاطین، علما، اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر — جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم - اے — ۱۶۵ - ۱۸۸
شاہ محمد غوث گوالیاریؒ — جناب پروفیسر مسعود احمد صاحب حیدر آباد سندھ — ۱۸۹ - ۲۰۴
مذکر احباب "کا تنقیدی جائزہ — جناب ڈاکٹر ام ہانی فخر الزماں صاحب ریڈر شعبۂ فارسی ویمنس کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ — ۲۰۵ - ۲۲۵
ظہیر فاریابی — جناب حکیم منظور الحسن صاحب برکاتی ٹونک — ۲۲۶ - ۲۳۱
دو نایاب تحریریں (استدراک) — جناب بشیر الحق صاحب دسنوی عظیم آبادی — ۲۳۲ - ۲۳۳

ادبیات

غزل — جناب کریم الرضا خاں صاحب انصار وکیل شاہجہانپور — ۲۳۴
" — جناب چندر پرکاش جوہر — ۲۳۴ - ۲۳۵
" — جناب ساجد امیٹھوی — ۲۳۵
مطبوعات جدیدہ — م - ج — ۲۳۶ - ۲۴۰

شذرات

اس دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ سے جو دینی و روحانی فیوض حاصل ہوئے، اس کی مثال دوسرے سلاسل میں مشکل سے مل سکتی ہے، اس اعتبار سے یہ پورا سلسلہ

این سلسلہ از طلائے ناب است — این خانہ تمام آفتاب است

کا مصداق ہے، اس سلسلہ میں آسمان علم و معرفت کے ایسے ایسے مہر و ماہ پیدا ہوئے جن کی روشنی سے سارا ہندوستان منور ہے اور آج اس ظلمتکدہ میں علم و عرفان کی جو روشنی بھی نظر آتی ہے وہ سب انہی نفوس قدسیہ کا پرتو ہے، اسی نورانی محفل کی ایک شمع فروزاں حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ تھے، وہ اس دور کے شیخ کامل اور قطب وقت تھے، ان کی ذات سے ایک مخلوق ہدایت یاب ہوئی، گمراہوں کو راہ راست ملی، ناقص کامل اور کامل صاحبِ احوال و مقامات ہوگئے، افسوس ہے کہ یہ شمع ہدایت گذشتہ مہینہ گل ہوگئی، گو الحمد للہ اب بھی اس سلسلہ میں بعض بڑی شخصیتیں موجود ہیں، لیکن "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"۔ حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اپنے رنگ میں منفرد تھے، ان کے ساتھ ان کی خصوصیات ختم ہوگئیں، "وہ بات کوہکن کی گئی کوہکن کے ساتھ"۔ اس لیے ان بزرگوں میں سے جو بھی اٹھتا ہے وہ اپنی جگہ ہمیشہ کے لیے خالی چھوڑ جاتا ہے، والبقاء للہ وحدہٗ، اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں حضرت شیخ کے درجات و مراتب بلند فرمائے،

دار المصنفین کے لیے دوسرا حادثہ مولوی عبد الغنی صاحب انصاری ریٹائرڈ کمشنر انکم ٹیکس کی وفات کا ہے، مرحوم علامہ شبلی کے عزیز، دار المصنفین کے پرانے ہمدرد و ہواخواہ اور اس کی مجلسِ انتظامیہ کے رکن تھے، ان کی ذات میں جدید و قدیم دونوں کی خوبیاں جمع تھیں، جدید تعلیم کے ساتھ پرانی وضعداری اور تہذیب و شرافت کا نمونہ تھے، اپنے دور کے قابل ترین افسروں میں ان کا شمار تھا، اپنی قابلیت، حسن اخلاق اور سیرت و کردار کی پختگی کی وجہ سے حکومت اور پبلک دونوں میں مقبول و ممدوح تھے، ریٹائر ہونے کے بعد قومی کاموں میں بھی دلچسپی لیتے تھے، ادھر عرصہ سے ان کی صحت خراب ہوگئی تھی، گذشتہ مہینہ کراچی میں انتقال کیا،

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے،

اردو کے بارہ میں یوپی لسانی کمیٹی کی رپورٹ کا خلاصہ بعض اخبارات میں شائع ہوگیا ہے، اس کمیٹی سے کچھ زیادہ توقعات تھیں بھی نہیں، چنانچہ اس کی سفارشوں میں کوئی نئی بات نہیں ہے، دوسری زبانوں کے طفیل میں اردو کو جو حقوق ملے ہیں، اور جن کو مرکزی اور صوبائی حکومتیں بھی مانتی ہیں، ان میں بعض جزوی ترمیموں اور اصلاحوں کے علاوہ اس کمیٹی نے کوئی ایسی سفارش نہیں کی ہے جس سے اردو کی پوزیشن میں کوئی خاص تبدیلی پیدا ہو، اسی لیے کمیٹی کے ہندی کے ارکان نے بھی ان سفارشوں سے کوئی اختلاف نہیں کیا ہے۔

ان سفارشوں میں پرانے نیم سرکاری اور آزاد اسلامی مکاتب کو لوکل بورڈ کے تعلیمی نظام کے ماتحت لاکر ان کو اردو میڈیم اسکول بنانے کی تجویز البتہ نئی ہے، اگرچہ یہ ہمیشہ سے اردو کے اسکول چلے آرہے ہیں، اس سے اردو کو نیا حق کیا ملا، ان کو سرکاری نظام تعلیم کے ماتحت لانے سے اگر اردو کی تعلیم میں کچھ سہولتیں حاصل ہوں گی تو اس کے شرائط خصوصاً مدرسین کے لیے مسلم کی شرط ختم کردینے سے ان مکاتب کو فائدے سے زیادہ نقصان پہنچے گا، اور ان کی دینی تعلیمی حیثیت بالکل ختم ہوجائے گی، ان کی بیسک ریڈروں کی زبان کے بارہ میں جو سفارش کی گئی ہے وہ اردو کے لیے سخت مضر ہے، اس سے اردو زبان ہندی بنجائے گی، اور رسم الخط کے علاوہ ان دونوں میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا، اگر کسی درجہ میں یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ ان سفارشوں سے اردو کو کچھ سانس لینے کا موقع مل جائے گا تب بھی ان تجویزوں پر عمل کا اصل مسئلہ باقی رہ جاتا ہے، جس کا ان سفارشوں میں بھی کوئی اطمینان بخش حل نہیں ہے، اور اردو کے مطالبات کے بعد سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ ان سفارشوں پر عمل کی کیا ضمانت ہوگی، اس کی دو ہی صورتیں ہیں، اردو کو جو حقوق بھی دیں ان کو قانونی حیثیت دیجائے، یا پھر حکومت کے عمال کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہو، جس کی سردست کوئی امید نہیں ہے، اس رپورٹ میں بعض اور خامیاں بھی ہیں، پوری رپورٹ شائع ہونے کے بعد ہم ان کے بارہ میں تفصیلی خیالات پیش کریں گے۔

مسلمانوں کے لیے ایک انگریزی اخبار کی جتنی شدید ضرورت ہے اس کے بارہ میں کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے، اس کا احساس تمام مسلمانوں کو ہے، چنانچہ بارہا اسکی تحریک ہوئی مگر عمل میں نہ آسکی، ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ سے زیادہ ہے، اور اس گئی گذری حالت میں بھی ان میں ایسے ایسے دولتمند موجود ہیں کہ چند آدمی اخبار کا خرچ برداشت کرسکتے ہیں، مگر کوئی جماعت ایسی نہیں ہے جو اس تحریک کو لیکر اٹھے اور انجام تک پہنچائے، اسی لیے آجتک اخبار نہ نکل سکا، اب جماعت اسلامی نے ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار نکالنے کا ارادہ کیا ہے، ممکن ہے کچھ لوگوں کو جماعت اسلامی کے بعض خیالات و نظریات سے اختلاف ہو، مگر یہ اخبار انکے خیالات و نظریات کا نہیں بلکہ عام مسلمانوں کے جذبات و ضروریات کا ترجمان ہوگا، اسی لیے جماعت اسلامی نے تمام مسلمانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی ہے۔

اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں کی تمام جماعتوں میں جماعت اسلامی سب سے زیادہ فعال جماعت ہے، اس کے پاس پُرجوش، سرگرم اور تعلیم یافتہ کارکنوں کی ایک پوری جماعت ہے، اسلیے وہ اس کام کو آسانی کے ساتھ انجام دے سکتی ہے، اس اخبار کے متعلق اس نے تمام ضروری معلومات شائع کردیے ہیں، یہ ایسا ضروری کام ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہوسکتا، اسلیے تمام مسلمانوں خصوصاً انکی مجالس اور تنظیموں کو اس فرض کفایہ میں پوری مدد کرنی چاہیے، ضرورت تو روزانہ اخبار کی تھی لیکن اس کے لیے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے، اس لیے سر دست ہفتہ وار بھی غنیمت ہے، اس کو ترقی دے کر آیندہ روزانہ بنایا جاسکتا ہے لیکن اخبار معیاری ہونا چاہیے۔

ونو بھاوے جی کی روح القرآن کا ہنگامہ اب ختم ہوچکا اور اس کی حقیقت پوری طرح ظاہر ہوچکی، مگر یہ ایسا افسوسناک واقعہ ہے کہ اس کے بعد بھی اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت باقی ہے، اس کی مصدقہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ونو بھاوے جی کلام مجید کی مختلف آیات کو مختلف عنوانوں کے تحت جمع کرکے اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں شائع کرنے والے ہیں، اور ان ترجموں میں تمام ممکن احتیاطیں کرلی ہیں، یہ کام کسی حیثیت سے بھی قابل اعتراض نہیں، اس قسم کے بہت سے مجموعے خود مسلمانوں بلکہ بہت سے علماء تک نے مرتب کیے ہیں، مگر آجتک انکو کسی نے بھی قابل اعتراض نہیں ٹھہرایا، اور انکو دین کی خدمت ہی سمجھا، اس لیے اگر ونو بھاوے جی نے قرآن کی بنیادی تعلیمات سے غیر مسلموں کی واقفیت کے لیے اسکی آیات کا کوئی مجموعہ مرتب کیا تو اس میں کیا قباحت ہوئی، یہ تو غیر مسلموں میں قرآنی تعلیمات کی تبلیغ کا ذریعہ ہے، اس لیے جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔

مقالات

ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب، ایم اے

(۶)

تفاوت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے زمانہ میں ایک جیتل میں دو سیر آٹا ملتا تھا، لیکن پھر بھی شروع زندگی میں ان کے پاس اتنے دام نہ ہوتے تھے کہ روٹی کے لیے آٹا خرید سکیں، کئی کئی روز کا فاقہ ہوجاتا، ایک بار مسلسل تین روز کا فاقہ ہوگیا تو کسی نے دروازہ پر دستک دی، اور ایک شخص خشک کھچڑی دے کر غائب ہوگیا، حضرت خواجہ نے بھوک کی شدت میں اس کو کھالیا، اور اس کو کھاکر جو لذت محسوس کی اس کا ذکر آیندہ بار بار فرماتے اور کہتے تھے کہ پھر کسی کھانے میں ایسی حلاوت محسوس نہیں ہوئی، جب گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہ ہوتی تھی تو ان کی والدہ ماجدہ کہا کرتی تھیں کہ آج ہم لوگ خداوند تعالے کے مہمان ہیں، حضرت خواجہ کو اس جملہ سے بڑی لذت ملتی، اور جب ان کے گھر میں آذوقہ ہوتا تو وہ افسوس کرتے کہ ان کی والدہ ماجدہ کی زبان پر وہ جملہ نہ ہوگا۔

بعض سلاطین و امراء کے غیظ و غضب اور غصہ و کینہ پروری کی بہت بری مثالیں ملتی ہیں، مثلاً سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں عماد الدین ریحان، سنقار اور الغ خاں میں بڑی معاصرانہ چشمک رہی، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اور حصول اقتدار کی خاطر فوجیں جمع کرکے میدان جنگ میں بھی اتر آتے تھے، بلبن کے عہد میں لکھنوتی میں طغرل نے بغاوت کی تو اس کی سرکوبی کرکے اس کے رشتہ داروں اور ساتھیوں کو تہ تیغ کیا گیا اور ان کے سروں کو سربازار لٹکا کر وہاں کے لوگوں کے دلوں میں دہشت پیدا کی گئی، علاء الدین خلجی تخت نشین ہوا تو اس نے جلال الدین خلجی کے شہزادوں ارکلی خاں، ابراہیم اور ان کی ماں کے خلاف تیس چالیس ہزار کا ایک لشکر جرار الغ خاں اور ظفر خاں کی نگرانی میں ملتان بھیجا، جنھوں نے دونوں شہزادوں اور ان کی ماں کو گرفتار کیا، پھر دونوں شہزادے نابینا کردیے گئے، اور ماں قید خانہ میں ڈال دی گئی، ظفر خاں عہد علائی کا بہت ہی بہادر فوجی رہنما تھا، اسی وجہ سے دربار کے اور امراء اس سے حسد کرتے تھے، وہ تاتاریوں کے خلاف لڑتا ہوا محض اس لیے مارا گیا کہ باہمی چشمک میں اور فوجی امراء اس کی مدد کو نہ پہنچ سکے، علاء الدین خلجی رن تنبھور کی مہم میں جارہا تھا تو تلپت کے پاس اس کے بھتیجے اکت خاں نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا اور وہ ہلاک ہوتے ہوتے بچا، اس نے اشتعال میں آکر اکت خاں اور اس کے ساتھیوں کو تہ تیغ کرادیا، وہ رن تنبھور ہی کی مہم میں تھا کہ اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاکر فخر الدین کوتوال کے لڑکے حاجی مولیٰ نے علم بغاوت بلند کردیا، اور ایک سید کو تخت پر بٹھایا، علاء الدین خلجی نے اپنے فوجی سرداروں کو بھیجکر یہ بغاوت فرو کرائی، حاجی مولیٰ اور سید کے ساتھ فخر الدین کوتوال کے اور لڑکے بھی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے،

اسی زمانہ میں صوفیۂ کرام نے حلم و بردباری کے جو نمونے پیش کیے، وہ اپنی مثال آپ ہیں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ ایک روز اپنی خانقاہ میں تشریف فرما تھے کہ دلق پوش قلندروں کی ایک جماعت پہنچی اور ان سے مالی مدد کی خواستگار ہوئی، انھوں نے اس جماعت سے بیزاری

کا اظہار فرمایا، اس پر قلندروں نے گستاخی شروع کردی اور اینٹ پتھر سے ان کو مارنے لگے، حضرت بہاء الدینؒ نے خادم سے فرمایا کہ خانقاہ کا دروازہ بند کردو، جب دروازہ بند ہوگیا تو قلندروں نے دروازہ پر پتھر مارنے شروع کیے، حضرت بہاء الدینؒ نے کچھ تامل کرنے کے بعد خادم سے فرمایا دروازہ کھول دو، میں اس جگہ بٹھایا گیا ہوں، خود سے نہیں بیٹھا ہوں، خادم نے دروازہ کھول دیا، اس وقت قلندر نادم ہوئے اور اپنے قصور کی معافی چاہی،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، خدا کی کسی مخلوق سے عناد رکھنا طریقت کے خلاف سمجھتے تھے، غیاث پور کے قریب کا رہنے والا ایک شخص چھجو نامی بلاوجہ حضرت محبوب الٰہیؒ کا دشمن ہوگیا تھا، اور ایذا رسانی پر کمر بستہ رہتا تھا، لیکن جب اس کی وفات کی خبر ان کو ملی تو اس کے جنازہ میں شریک ہوئے اور تدفین کے بعد اس کی قبر پر دوگانہ نماز ادا کی، اور اس کی مغفرت کے لیے دعائیں کیں،

اگر ان کو کسی پر غصہ آتا، تو نہ صرف غصہ کو پی جاتے بلکہ اس کو معاف بھی کردیتے، اور فرماتے کہ جو شخص غصہ پی جاتا ہے اور معاف نہیں کرتا ہے تو ممکن ہے کہ اس کے دل میں کینہ گھر کرلے، فوائد الفواد میں ہے کہ ایک بار ایک شخص حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے پاس آیا اور ان کو گالیاں دینے لگا، وہ خاموشی سے سنتے رہے، پھر اس نے جو کچھ مطالبہ کیا پورا کردیا، اور جب وہ چلا گیا تو حاضرین کو مخاطب کرکے کہا کہ ایک شخص ایک مرتبہ بابا فرید کے پاس آیا، اور گستاخانہ طور پر کہنے لگا تونے اپنے کو بت بنالیا ہے، بابا فرید نے نرمی سے جواب دیا کہ میں نے اپنے کو نہیں بنایا ہے خداوند تعالیٰ نے مجھکو بنایا ہے، سیر الاولیاء میں ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا کہ کسی کو برا کہنا برا ہے، لیکن برا چاہنا اس سے بھی برا ہے، فوائد الفواد میں ہے کہ حضرت خواجہ نے فرمایا کہ ایک شخص سے دوسروں کو نہ فائدہ پہنچے اور نہ نقصان تو ایسا شخص جماد کہلاتا ہے، لیکن ایسے شخص سے وہ شخص بہتر ہے جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے، نقصان نہیں پہنچتا ہے، لیکن ان دونوں سے وہ شخص بہتر ہے کہ اس سے

دوسروں کو ہمیشہ فائدہ پہنچتا ہے، لیکن لوگ اس کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں، پھر بھی وہ تحمل اور حلم سے کام لیتا ہے، یہ کام صدیقوں کا ہے۔

درباری سازشوں سے سلاطین اور امراء کے جتنے قتل ہوئے، ان کی گنتی ممکن نہیں، مملوک سلاطین میں آرام شاہ، سلطانہ رضیہ، بہرام شاہ، خلجی حکمرانوں میں جلال الدین خلجی، قطب الدین مبارک خلجی، اور اس خاندان کا غاصب خسرو خاں، تغلق خاندان میں سلطان ابوبکر شاہ، اور خاندان سادات میں معز الدین مبارک شاہ، اور لودیوں میں ابراہیم لودی تہ تیغ ہوئے، اور پھر باہمی کینہ پروری، بغض اور حسد کی وجہ سے سلاطین دہلی کے عہد میں ملک اختیار الدین ایتگین، ملک التونیہ، امیر سنقار، ملک طغرل، ملک اکت خاں، ظفر خاں اور ملک کافور وغیرہ جیسے جلیل القدر امرا بھی نذر شمشیر ہوئے۔

لیکن اسی عہد میں صوفیۂ کرام نے اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ جو حسن سلوک کیا، وہ انسانی تاریخ کی عجیب و غریب مثالیں ہیں، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خانقاہ میں ایک بدباطن شخص ان کو قتل کرنے کے ارادہ سے آیا، لیکن انھوں نے نور باطن سے یہ معلوم کرلیا اور اس کو اپنے پاس بلا کر کہا کہ جس ارادہ سے آئے ہو اس کو پورا کرو، یہ سن کر اس پر لرزہ طاری ہوگیا اور اس نے کہا کہ مجھکو لالچ دے کر آپ کو ہلاک کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے، خواجہ صاحب نے اس کو یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ ہم درویشوں کا شیوہ ہے کہ ہم سے کوئی بدی بھی کرتا ہے تو ہم اس کے ساتھ نیکی سے پیش آتے ہیں۔

ایک روز حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ نماز ظہر کے بعد جماعت خانہ میں آکر اپنے حجرۂ خاص میں مشغول تھے کہ ایک قلندر تراب نامی وہاں پہنچا، اور ان پر چھری سے پے در پے حملے کیے، خون حجرے کے باہر بہنے لگا، لیکن ان کے استغراق میں فرق نہیں آیا، خون دیکھ کر

مریدین حجرے میں گئے اور قلندر کو سزا دینی چاہی، لیکن حضرت چراغ دہلویؒ نے روکا اور اپنے مریدین خاص کو پاس بلا کر قسم دی کہ کوئی شخص قلندر کو ایذا نہ پہنچائے، پھر قلندر سے معذرت کی کہ اگر چھریاں مارتے وقت تمھارے ہاتھ کو تکلیف پہنچی ہو تو معاف کرنا، اور بیس تنکے زر دے کر اس کو رخصت کیا۔

حُبِ جاہ اور حرص اقتدار کی خاطر امراء نے بڑے بڑے نمونے پیش کیے، دہلی کی سلطنت کی تاسیس کے چار سال کے اندر قطب الدین ایبک کی وفات ہوگئی، تو ناصر الدین قباچہ نے ملتان پر قبضہ کر لیا، بنگال میں علی مردان خلجی نے دہلی کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے روگردانی کی، بدایوں کے لوگ التتمش کے ساتھ ہوگئے، اسی طرح التتمش کی وفات کے بعد سندھ اور اچہ پر سیف الدین قرلغ حملہ آور ہوگیا، اودھ میں بغاوت ہوگئی، بنگال، بہار، ملتان مرکز سے منقطع ہوگئے، امراء کی بغاوتوں کو سر کرنے میں سلاطین کی فوجی، مالی اور دماغی قوتیں برابر صرف ہوتی رہیں، لیکن اسی زمانے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے مریدوں کو یہ تعلیم دے رہے تھے کہ عارف صادق وہ ہے کہ اس کی ملک میں کچھ نہ ہو، اور نہ وہ کسی کی ملک ہو، عارف کا اشعار بے نیازی ہے، عارف وہ نہیں ہے جو کسی چیز کے پیچھے پریشان ہو، حضرت بختیار کاکیؒ نے دنیا کی آلائشوں سے دور رہنے کی تلقین یہ بتا کر دی کہ حضرت بایزید بسطامی نے ستر سال تک عبادت کی، مگر جب مقام قرب آیا تو ان کو قربت محض اس وجہ سے حاصل نہ ہوسکی کہ ان کے پاس دنیاوی آلائشوں میں مٹی کا ایک کوزہ اور چمڑے کا ایک خرقہ باقی رہ گیا تھا، ان کو پھینک دیا تو یہ درجہ حاصل ہوا، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ فرماتے تھے کہ سالک کو رزق حاصل کرنے کے لیے بھی پریشان خاطر نہ ہونا چاہیے، اگر وہ اس کے لیے پریشان رہتا ہے تو وہ بددین اور بددیانت ہے،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے فقر و فاقہ کی خبر جلال الدین خلجی کو ہوئی تو اس نے ان کی خدمت میں یہ کہلا بھیجا کہ اگر وہ حکم دیں تو ان کے خدمت گزاروں کے لیے کچھ گاؤں نذر کیے جائیں مگر حضرت خواجہ کے فاقہ مست جاں نثاروں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کے یہاں ہم کبھی کبھی روٹی کھالیتے ہیں، لیکن یہ گاؤں قبول کرلیے گئے تو اس کے بعد ہم آپ کے یہاں پانی پینا بھی پسند نہ کریں گے یہ جواب سن کر حضرت خواجہ بے حد محظوظ ہوئے، قاضی محی الدین کاشانی حضرت خواجہ کے بڑے ممتاز مرید تھے، ان کے پاس ایک جاگیر کا شاہی فرمان تھا، لیکن جب حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے تو اپنی جاگیر کا شاہی فرمان مرشد کے سامنے لاکر چاک کر دیا، اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے لگے۔

سلاطین و امراء جب دنیاوی آلائشوں میں مبتلا ہو کر جائز و ناجائز و حلال و حرام میں کوئی امتیاز نہ کرتے تھے، تو اس وقت یہی بزرگان دین رضا و تسلیم، صبر و شکر، توکل و قناعت اور ذکر و فکر کے ذریعہ تزکیۂ نفس، تصفیۂ دل اور تجلیۂ روح میں لگے ہوئے تھے، جن کو حاصل کرنے کے بعد وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے، اور ان کی حکومت سلاطین کی حکومت سے زیادہ مقبول ہوتی وہ فوجوں کے بجائے دلوں کو ٹکرا کر ان میں ایک طوفان بپا کر دیتے جس سے لوگوں کے کردار میں صفائی، اخلاق میں پاکیزگی اور روح میں بالیدگی پیدا ہوتی رہتی، اور ان ہی خوبیوں سے بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار بنتا، اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمان ہندوستان میں اگر مجموعی حیثیت سے اچھے اخلاق اور مستحکم کردار کا ثبوت نہ دیتے، تو شاید اس زمین میں جڑ نہ پکڑ سکتے بلکہ اور قوموں کی طرح یہاں کے باشندوں میں ضم ہو جاتے، کردار و اخلاق کو سنوارنے کے لیے اسلام کی باضابطہ تعلیم ضرور تھی، لیکن ان کے عملی نمونے ہندوستان میں صوفیہ اور صلحاء پیش کرتے رہے، اور یہ کہنے میں تامل نہیں کہ شروع میں ان ہی بزرگان دین کے فقر سے مسلمانوں میں اخلاق کے اسرار جہانگیری واضح ہوتے رہے، ان ہی بزرگوں کی قلندری

سے مسلمانوں کو صحیح معنوں میں سیرت کی تونگری حاصل ہوتی رہی، اور ان ہی کی درویشی سے مسلمانوں کے کردار کی سکندری کی راہ کھلی،

اخلاق و کردار کے معمار

شہاب الدین غوری کی فتح کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار شروع ہوا، تو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی وجہ سے ہندوستان ان کے مختلف قسم کے برکات سے مستفیض ہوا، انھوں نے صوری و معنوی اخلاق کے محاسن کی اسلامی تعلیم اپنے کردار و سیرت کے عملی نمونے سے کچھ اس طرح پیش کی کہ یہاں کے غیر مسلموں کو بھی اسلام کے جلوے ان ہی میں نظر آنے لگے، اور انھوں نے اس سرزمین میں اسلام کے نور کو اس طرح پھیلایا کہ وہ "وارث النبی فی الہند" کے لقب سے اب تک یاد کیے جاتے ہیں، تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ ان کی نظر جس فاسق پر پڑ جاتی وہ تائب ہو جاتا اور پھر کبھی کسی گناہ میں مبتلا نہ ہوتا، اور ان ہی کی نظر کیمیا اثر کی وجہ سے ان کے خلفاء کی ایک بڑی جماعت تیار ہوئی جو محض اپنے بلند اخلاق اور پاکیزہ صفات کی وجہ سے لوگوں پر حکومت کرتی رہی، اور جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ فوج کشی میں مشغول تھے تو یہ بوریا نشین مختلف مقامات پر پہنچ کر دلوں کی تسخیر میں لگے ہوئے تھے، حضرت خواجہ کے اکابر خلفاء میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ اور حضرت حمید الدین ناگوریؒ کی روحانی راجدھانی دہلی تھی، شیخ حمید الدین سوالیؒ نے ناگور میں قیام کر کے اس کو اپنے روحانی جلووں سے معمور کیا، دوسرے خلفاء میں شیخ وجیہ الدین، خواجہ برہان الدین، شیخ صدر الدین کرمانی، شیخ محمد ترک نارنولی، شیخ علی سجزی اور خواجہ یادگار سبزواری نے مختلف جگہوں میں جاکر لوگوں کے اخلاق و سیرت کو سنوارا، اور اسلام کی شوکت قائم کی،

مورخوں اور تذکرہ نگاروں دونوں کا بیان ہے کہ التمش کے عہد میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، شیخ حمید الدین ناگوریؒ، شیخ علی سجزیؒ، شیخ احمد نہروالیؒ، شیخ بدر الدین سمرقندیؒ

سید قطب الدین غزنویؒ، حضرت نظام الدین ابو المؤید غزنویؒ، اور شیخ محمود موینہؒ وغیرہ کی برکتوں سے اس عہد کے لوگوں میں خدا ترسی، تقویٰ، تزکیۂ نفس، عبادت اور ریاضت کا غیر معمولی جذبہ پیدا ہوا، بلبن کے عہد میں اتنے مشائخ اور سادات جمع ہوگئے تھے کہ مورخوں نے ان کے وجود کی وجہ سے اس عہد کو خیر الاعصار لکھا ہے، حضرت بابا گنج شکرؒ، خواجہ علی چشتیؒ، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، ان کے صاحبزادے شیخ صدر الدینؒ، سیدی مولہؒ، شیخ حسام الدین ملتانیؒ، شیخ نجیب الدین فردوسیؒ، شیخ ابوبکر حیدر طوسیؒ وغیرہ کے انوار سے پوری سلطنت منور ہوگئی تھی۔

علاء الدین خلجی کے عہد میں علماء کے اجتماع سے دہلی قبۂ اسلام اور رشک مکہ و مدینہ ہوگئی تھی، تو صوفیۂ کرام کے وجود سے بھی یہ شہر آراستہ تھا، مولانا ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ اس زمانہ کے مشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت علاء الدین چشتیؒ اور حضرت رکن الدین سہروردیؒ کے انفاس متبرکہ سے ایک دنیا روشن ہوگئی تھی، گنہگاروں نے ان کے ہاتھ پکڑ کر گناہوں سے توبہ کی، بدکاروں نے بدکاری سے ہاتھ اٹھایا، اور ان دینی بادشاہوں کی محبت اور اخلاق کے اثر سے خداوند تعالیٰ کے فیض کی بارش دنیا میں ہونے لگی، ان بزرگوں کے وجود سے شعائر اسلام اور احکام شریعت کو بہت فروغ ہوا اور طریقت نے بڑی رونق پائی،

مولانا ضیاء الدین برنی یہ بھی لکھتے ہیں کہ کتنا عجیب زمانہ وہ تھا جو سلطان علاء الدین کے آخری دسویں سال میں نظر آیا، ایک طرف سے سلطان علاء الدین نے ملک کی بہتری کے لیے تمام نشہ آور اور ممنوع چیزوں اور فسق و فجور کے اسباب کو قہر و غلبہ، تعزیر و تشدد اور قید و بند سے روک دیا، مالداروں سے ان کی سود خواری، ذخیرہ اندوزی اور بغاوت کو ختم کر دیا، پھر بازار والوں کو جو سب سے زیادہ جھوٹ بولتے ہیں، سچ بولنے پر مجبور کیا، دوسری طرف اسی زمانہ میں شیخ الاسلام نظام الدین اولیا نے بیعت کا عام دروازہ کھول کر خاص و عام، غریب و دولتمند،

عالم و جاہل، شہری و دیہاتی، سب کو پاکی کی تعلیم دیتے تھے، اور ان کی وجہ سے مرد، عورت، بوڑھے، جوان، بازاری، عامی، غلام اور نوکر سب کے سب نماز ادا کرنے لگے تھے، خواص و عوام کے دلوں نے نیکی اختیار کر لی تھی، عہد علائی کے آخری چند سالوں میں شراب، معشوق، فسق و فجور، جوا اور فحاشی وغیرہ کا نام لوگوں کی زبان پر نہیں آنے پاتا، وغیرہ وغیرہ،

حضرت نظام الدین اولیاؒ کا زمانہ محمد تغلق کی حکومت کے ابتدائی دور تک رہا، محمد تغلق ان سے کسب فیض تو نہ کر سکا، لیکن جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے، وہ چشتیہ سلسلہ کے بزرگ حضرت بابا گنج شکرؒ کے پوتے حضرت شیخ علاء الدینؒ کا مرید تھا، اس کے بارہ میں عام طور سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے مشائخ کو ایذائیں پہنچایا کرتا تھا، جیسا کہ آگے بیان ہوگا، لیکن اس کے عہد میں حضرت فخر الدین زرادیؒ، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ، حضرت قطب الدین منورؒ اور حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ سے عوام و خواص کو بڑا فیض پہنچا، یہی بزرگ فیروز شاہی عہد میں بھی رہے، ان کے علاوہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کا اثر فیروز شاہ پر بہت تھا، ان بزرگوں کے اثرات کی وجہ سے شریعت کے احیاء اور بدعات کی روک تھام میں بڑی مدد ملی، بیت المال میں غیر مشروع اور حرام مال روک دیا گیا، محل کے اندر دیواروں پر مصوری اور نقاشی ختم کر دی گئی، چاندی اور سونے کے ظروف کا استعمال بند کر دیا گیا، ممالک محروسہ میں جو باتیں خلاف شرع نظر آئیں قطعاً موقوف کر دی گئیں،

عجیب توارد اور یہ عجیب توارد ہے کہ خواجگان چشت کا سلسلۃ الذہب، حضرت خواجہ نصیر الدینؒ کی ذات پر ختم ہوا، تو سلاطین دہلی کا عروج بھی فیروز شاہ تغلق کے ساتھ جاتا رہا، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے مرض الموت میں مولانا زین الدین علی نے عرض کیا کہ

آپ کے اکثر مرید اہل کمال ہیں، کسی کو سجادہ نشین مقرر فرمائیں، تاکہ سلسلہ جاری رہے۔ فرمایا ان درویشوں کے نام لکھ کر لاؤ جن کو تم اس لائق سمجھتے ہو۔ مولانا زین الدین نے تین قسم کے درویشوں کا انتخاب کیا، اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ، حضرت خواجہ نے ان کے نام کو دیکھ کر فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دین کا غم کھائیں گے، لیکن دوسروں کا بار نہ اٹھا سکیں گے۔ اس کے بعد وصیت فرمائی کہ دفن کرتے وقت حضرت شیخ نظام الدینؒ کا خرقۂ مبارک، عصا، تسبیح، کاسہ اور چوبیں نعلین ان کے ساتھ قبر میں دفن کر دیے جائیں، اور ایسا ہی کیا گیا۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے بعد حضرت خواجہ گیسو درازؒ اور حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ، شیخ جلال الدین تھانیسریؒ، شیخ عبد العزیز چشتی دہلویؒ، شیخ سلیم چشتیؒ، شیخ دانیال چشتیؒ، شیخ علاء الدین مجذوبؒ، شیخ جودھن جونپوریؒ، سید علاء الدین مجذوبؒ نے چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کی تعلیم تو جاری رکھی، لیکن وہ اپنے پیش رو بزرگوں کی طرح ایک غیر معمولی روحانی طاقت بن کر لوگوں کے دل و دماغ پر نہ چھا سکے، گوالیار سے شطاریہ سلسلہ چلا، اور خود دہلی میں حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندیؒ اور ان کے خلفاء کے ذریعہ نقشبندیہ سلسلہ کی تعلیمات کی ترویج ہوئی، لیکن عہد اکبری کے آتے آتے تصوف میں اتنی خرابیاں پیدا ہو گئیں کہ اس کے ذریعہ پہلے کی طرح روحانی تربیت و اصلاح کا کام خاطر خواہ طریقہ پر نہ ہو سکا۔

خام صوفیہ

یہ خرابیاں اس لیے پیدا ہوئیں کہ حضرت بختیار کاکیؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ اور خواجہ نظام الدین اولیاءؒ جیسے جلیل القدر صوفیہ پیدا نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر خام صوفیہ پیدا ہونے لگے، اور وہ تصوف کی روح سے بیگانہ ہو کر اس کے ظاہری رسوم پر زیادہ زور دینے لگے، اور جب وحدت الوجود کے مسئلہ میں زیادہ گرماگرمی پیدا ہوئی تو وہ اس کے اصلی رموز کو تو سمجھ نہ سکے، اتحاد و حلول کی ظاہری باتوں میں بہہ کر گمراہ ہو گئے، جیسا کہ آگے ذکر

آئے گا، اسی طرح وہ اپنے سلسلہ کے بزرگوں کی اصلی تعلیمات کو بھلا کر صرف ان کے کشف و کرامات ہی کو تصوف قرار دیتے رہے، وہ سنت و شریعت کو بھول کر غیر شرعی ریاضات و مجاہدات اور غیر اسلامی احوال و مواجید کے قائل رہے، نماز روزے کو باطن کی درستگی کے بعد غیر اہم قرار دیا، سماع کی اصلی حقیقت کو نظر انداز کر کے نغمہ اور رقص پر زیادہ زور دینے لگے، ادھر کبیر، رامانند، اور چیتن وغیرہ کی جو روحانی تحریکیں اٹھیں، تو ایک گروہ اس کا بھی قائل ہو گیا کہ رام اور رحیم دونوں ایک ہیں، دنیا کا مالک ایک ہے، اس تک پہنچنے کے لیے محض اخلاص، محبت اور تلاش کی ضرورت ہے، کسی کی وساطت اور شفاعت درکار نہیں ہے، خالق مخلوق میں ہے اور مخلوق خالق میں ہے، یہ دونوں الگ الگ نہیں ہیں، یہ تحریکیں کچھ ایسی دل آویز تھیں کہ ان میں کچھ مسلمان بھی شریک ہو گئے،

حضرت مجددؒ کی اصلاحی کوششیں

حضرت مجددؒ نے اسی قسم کی تمام باتوں کو بدعت قرار دیا اور مسلمانوں میں ان بدعتوں کے خلاف تجدیدی اور اصلاحی تحریک شروع کی، اور ایسے تصوف کو ضلالت سے تعبیر کیا، جس میں شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہو، اور ایسے احوال و کیفیات کو جو نامشروع طریقہ پر مترتب ہوں، استدراج کہا، انھوں نے کسی چیز کی حلت یا حرمت کے سلسلہ میں اولیائے کرام کے الہام کو تسلیم کرنے سے بالکل انکار کیا، اسی طرح ارباب باطن کے کشف کو کسی چیز کے فرض یا سنت ہونے کی دلیل قرار نہیں دیا، اور صاف طور پر بتایا کہ علوم لدنیہ کی صحت و مقبولیت کی علامت صریح علوم شرعیہ کے ساتھ ان کی مطابقت ہے، اس کے خلاف جو کچھ ہے، الحاد اور بے دینی ہے، سنت سے ہٹ کر جو ریاضتیں کی جاتی ہیں، وہ صریحاً گمراہی ہے، وہ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ جو کوئی جس قدر شریعت میں راسخ اور ثابت قدم ہوگا اسی قدر ہوائے نفس سے دور ہوتا جائے گا، کیونکہ نفس کے لیے

شریعت کے اوامر و نواہی کے بجا لانے سے زیادہ دشوار کوئی اور چیز نہیں، اور حسب رضا شریعت کی پیروی کے بعد کسی خرابی کا تصور نہیں آسکتا، اسی لیے وہ ریاضتیں اور مجاہدے جو سنت کی تقلید کے سوا اختیار کیے جائیں وہ معتبر نہیں ہیں، وہ اپنے ایک مکتوب میں شیخ نظام تھانیسری کو یہ بھی لکھتے ہیں کہ جس طرح آپ کی مجلس میں تصوف کی کتابوں کا ذکر ہوتا رہتا ہے، اسی طرح فقہ کی کتابوں کا بھی ذکر ہونا چاہیے، اور اگر تصوف کی کتابیں نہ پڑھی جائیں تو کوئی ہرج نہیں، کیونکہ وہ احوال سے تعلق رکھتی ہیں، اور قال میں نہیں آتیں، لیکن کتب فقہ کے نہ پڑھنے پر ضرر کا احتمال ہے، اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال متابعت عطا فرمائے۔ وہ خام صوفیوں کے سماع و نغمہ اور وجد و تواجد کی بھی مذمت کرتے رہے، جیسا کہ آگے ذکر آئیگا۔

حضرت مجددؒ نے جس طرح دین کی تجدید کی، اور اکبر کے دین الٰہی کے فتنوں کا سدباب اپنے اصلاحی اور تجدیدی کارناموں سے کیا، اسی طرح تصوف کی بھی تجدید کی، جس کو ان کے صاحبزادوں میں خواجہ محمد صادق، خواجہ محمد سعید اور عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم، اور خلفاء میں میر محمد نعمان کشمی، مولانا محمد ہاشم کشمی، خواجہ سید آدم بنوری حسینی، شیخ طاہر لاہوری، شیخ بدیع الدین سہارنپوری، شیخ نور محمد پٹنی، شیخ حمید بنگالی، شیخ طاہر بدخشی، مولانا یوسف سمرقندی، مولانا احمد برکی، مولانا محمد صالح کولابی، سید محب اللہ مانکپوریؒ، حاجی خضر افغان، شیخ بابا حسن ابدالی، مولانا امان اللہ لاہوری وغیرہ نے اپنی کوششوں سے برقرار رکھا، اور یہ اب علما بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان ہی کے فیوض و برکات کی وجہ سے شاہ جہاں اور عالمگیر جہانگیر اور اکبر سے بالکل مختلف حکمراں گذرے،

صوفیہ کا فقدان اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ عالمگیر کے بعد جس طرح اچھے علما کا پیدا ہونا بند ہو گیا، اسی طرح اچھے صوفیہ کا بھی فقدان ہو گیا، یہاں تک کہ میر محمد حسین رضوی مشہدی

جو اپنے کو فربود و نمود اللہ کہتا تھا، قبلہ حاجات اور گہوارۂ سعادت سمجھا جانے لگا، اور تصوف بازیچۂ کان بن گیا، شاہ عبدالعزیزؒ کے ملفوظات میں ہے کہ محمد شاہ کے زمانے میں ہر سلسلہ اور طریقہ کے بائیس بزرگ صاحب ارشاد دہلی میں موجود تھے، ان ہی میں مرزا مظہر جان جاناں اور حضرت فخر الدین دہلوی بھی تھے، ان سے پیاس بجھ تو جاتی تھی، لیکن ان میں ان کے اکابر اسلاف کی روح نہیں تھی، اور پھر صوفیۂ خام کی اتنی کثرت ہو گئی تھی کہ یہ خود بھی گمراہیوں میں مبتلا رہے، اور اس زمانہ کے مسلمانوں کو بھی مبتلا کیا، جیسا کہ آگے ذکر آئے گا

سلاطین و مشائخ کا تصادم سلاطین و صوفیہ کی زندگی کی نوعیت میں جو بعد المشرقین رہا، اس لحاظ سے دونوں میں یگانگت پیدا ہونے کا امکان نہ تھا، لیکن صوفیہ کرام کی یہ کرامت تھی کہ وہ ہر دور میں سلاطین کو اپنے آستانوں پر جھکاتے رہے، اور یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ علما، تو سلاطین سے مذہبی، فقہی مسائل اور طرز حکومت کی نوعیت پر بہت الجھے، لیکن صوفیۂ کرام نے ان سے الجھنے کے بجائے ان کو اپنے قریب تر کر دیا، کچھ ایسے سلاطین بھی گزرے ہیں جن کا تصادم ان کے بعض معاصر مشائخ سے ہوا، لیکن ان کی مثالیں بہت زیادہ نہیں ہیں، اس تصادم کا جائزہ لینے سے پہلے ایک بات کی وضاحت ضروری ہے، اور وہ یہ کہ تذکرہ نگار جب بوریا نشینوں اور تخت نشینوں کے تعلقات کا ذکر کرتے ہیں تو وہ کچھ نہ کچھ ایسی باتیں تخت نشینوں کے متعلق ضرور قلمبند کر دیتے ہیں جن سے ان کے خیال میں درویشی کی عظمت اور جلالت بڑھ جاتی ہے، لیکن تنقید و تجزیہ کے بعد ان کے بیانات میں بڑی کمزوری دکھائی دیتی ہے، مگر کچھ مورخین ایسے بھی ہیں جو ان تذکرہ نویسوں کے بیانات سے فائدہ اٹھا کر سلاطین کے کردار کو اس طرح پیش کرنے لگے جن سے وہ خواہ مخواہ بدنام ہو جاتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ کچھ درباری مورخین ایسے بھی ہیں جو

اپنے شاہی آقاؤں کا حق نمک ادا کرنے کی خاطر مشائخ کی اچھی تصویر نہیں کھینچتے ہیں، اس طرح تذکرہ نگاروں اور مورخوں دونوں کی غیر دارانہ تحریروں سے اس عہد کی تاریخ کو نقصان پہنچا ہے، اسی لیے ان اختلافات میں دونوں کے بیانات کو قبول اور رد کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے،

سلاطین اور صوفیہ کے اختلافات کی پہلی مثال سلطان جلال الدین خلجی اور سیدی مولہ کے تصادم میں ملتی ہے، مولانا ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں، سیدی مولہ عجیب و غریب بزرگ تھے، نماز کے پابند تھے، لیکن جماعت کے ساتھ نماز ادا نہیں کرتے تھے، کوئی کچھ دیتا تو اس کو قبول نہ کرتے، لیکن ان کے اخراجات اتنے تھے کہ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی، کہ وہ اخراجات پورا کرنے کے لیے روپے کہاں سے لاتے ہیں، لوگ کہتے کہ وہ علم کیمیا جانتے ہیں، ان کی خانقاہ میں روزانہ ہزاروں من میدہ خرچ ہوتا تھا، پانچ سو جانور ذبح کیے جاتے تھے، دو تین سو من شکر اور سو دو سو من نبات خریدی جاتی تھی، ان کے یہاں امراء کی آمد و رفت برابر رہتی، اور ایسے امراء نے جو سلطان جلال الدین خلجی سے بدظن تھے، اس خانقاہ میں بیٹھکر یہ سازش کرنی چاہی کہ سلطان جلال الدین خلجی کے بجائے سیدی مولہ کو حکمراں بنایا جائے، اس کی خبر سلطان کو ہوئی تو اس نے سیدی مولہ اور ان بدباطن امراء کو اپنے سامنے بلایا، انھوں نے اپنے جرم سے انکار کیا، تو سلطان نے چاہا کہ اس زمانے کے رسم کے مطابق ان کو آگ میں ڈال دیا جائے تاکہ اگر وہ سچے ہونگے تو بچ جائیں گے اور جھوٹے ہوئے تو ہلاک ہو جائیں گے، علماء نے اس کی مخالفت کی کہ آگ کے ذریعہ سے جھوٹ اور سچ کی تمیز نہیں کی جا سکتی ہے، اور یہ فعل نامشروع ہے، سلطان نے یہ ارادہ ترک کر دیا، اور سیدی مولہ کو بندھوا کر اپنے محل کے پاس بلوایا اور ان سے مباحثہ کیا، اور جب بحث جاری تھی تو حیدری

جماعت کے ایک فرد نے بڑھ کر سیدی مولہ کو استرے سے زخمی کر دیا، اور سلطان جلال الدین خلجی کے لڑکے ارکلی خاں کے اشارہ سے ایک فیل بان ہاتھی لیکر دوڑا اور سیدی مولہ کو ہاتھی کے پاؤں سے مسل ڈالا، مولانا ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ جلال الدین خلجی جیسے حلیم اور بردبار بادشاہ کی وجہ سے درویشی کی عزت جاتی رہی، لیکن جس روز سیدی مولہ کا قتل ہوا، اس روز اتنی زبردست آندھی آئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ قیامت آگئی ہے، جلال الدین خلجی نے اس کے بعد محسوس کیا کہ اس سے ایک غلط کام ہو گیا ہے، یہ تصادم ذاتی اشتعال یا سیاسی مصالح کی بنا پر ہوا، اس میں اصولی اختلاف نہ تھا،

البتہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے اپنی زندگی کا یہ اصول بنا رکھا تھا کہ وہ کسی سلطان وقت سے نہ ملیں گے، اس سلسلہ میں بعض سلاطین سے ان کا شدید اختلاف رہا، سلطان جلال الدین خلجی کو حضرت خواجہ کے شرف ملاقات کی بڑی تمنا تھی، لیکن اس کی یہ تمنا پوری نہیں ہوئی، اس کے دربار سے امیر خسرو وابستہ تھے، اس لیے اس نے بھیس بدل کر امیر خسرو کے ساتھ حضرت خواجہ کا دیدار حاصل کرنا چاہا، امیر خسرو بھی اس کے لیے راضی ہو گئے، لیکن یکایک ان کو خیال ہوا کہ اپنے دنیادی آقا کو خوش کرنے میں کہیں ان کے روحانی آقا ناخوش نہ ہو جائیں، اس لیے اپنے مرشد سے سلطان کے ارادہ کو ظاہر کر دیا، حضرت خواجہ کو یہ معلوم ہوا تو اسی وقت شہر چھوڑ کر اپنے مرشد کے مزار کی زیارت کے لیے اجودھن روانہ ہو گئے، سلطان جلال الدین کو خبر ملی تو امیر خسرو سے یہ راز فاش کرنے کی بازپرس کی، امیر خسرو نے بڑی جرأت کے ساتھ سلطان کو جواب دیا کہ آپ رنجیدہ ہوں گے تو زیادہ سے زیادہ میری جان کا خطرہ ہے لیکن مرشد آزردہ ہوتے تو میرے ایمان کا خطرہ ہے، سلطان یہ جواب سنکر خاموش ہو گیا،

سلطان علاء الدین خلجی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے پاس نذریں بھیجتا،

ان سے اپنی فوجی مہم کی کامیابی کے لیے دعاؤں کا طلبگار رہتا، ان کی مجلس سماع کا ذکر شوق سے سنتا، لیکن اس حسن عقیدت کے باوجود دونوں میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی، اور جب اس سے حضرت خواجہ سے نہ ملنے کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا کہ میں بادشاہ ہوکر سر سے پاؤں تک گناہوں میں آلودہ ہوں، اس آلودگی کی وجہ سے ایسے پاک بزرگ سے ملنے میں شرم آتی ہے۔

عوام و خواص میں حضرت خواجہ کی مقبولیت بہت بڑھ گئی تو علاء الدین خلجی کو سلطان وقت کی حیثیت سے ایک موقع پر رشک پیدا ہوا کہ کہیں وہ اس کے لیے خطرہ نہ بنجائیں، اس لیے ان کو آزمانے کی خاطر لکھ بھیجا کہ خداوند تعالیٰ نے دنیا کی سلطنت کی باگ ہمارے ہاتھ میں دی ہے تو ہم کو چاہیے کہ ملک کی بھلائی اور اپنی بہتری کے لیے آپ سے بھی مشورہ کرکے ان پر عمل کرتے رہیں، لیکن حضرت خواجہ کی طرف سے یہ پیام تھا کہ فقیروں کو بادشاہوں کے کام سے کیا مطلب میں ایک فقیر ہوں، اور ایک گوشہ میں رہتا ہوں، بادشاہوں اور مسلمانوں کی دعاگوئی میں مشغول ہوں، اس کے بعد بھی بادشاہ مجھ سے کچھ کہے گا تو میں اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں گا، خدا کی زمین کشادہ ہے، سلطان علاء الدین کو یہ پیام پہنچا تو وہ ان کا اور بھی معتقد ہوگیا، اور پھر ملاقات کی خواہش ظاہر کی، لیکن حضرت خواجہ نے کہلا بھیجا کہ آنے کی ضرورت نہیں ہیں غائبانہ دعا میں مشغول ہوں، اور غائبانہ دعا اثر رکھتی ہے، سلطان نے پھر اصرار کیا تو حضرت خواجہ نے آزردہ ہوکر کہا کہ اس ضعیف کے گھر میں دو دروازے ہیں، اگر بادشاہ ایک دروازہ سے تشریف لائے تو میں دوسرے دروازہ سے نکل جاؤں گا،

سلطان علاء الدین خلجی کی وفات کے بعد اس کا لڑکا قطب الدین مبارک خلجی ملک، کافور کی مدد سے اپنے دو بھائیوں خضر خاں اور شادی خاں کو قتل کرکے تخت نشین ہوا، یہ دونوں شہزادے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے عزیز مریدوں میں تھے، اس لیے سلطان قطب الدین خلجی

ان سے بدگمان رہا، اس کی یہ بدگمانی عداوت میں تبدیل ہوگئی، اور وہ مصلحتاً سہروردیہ سلسلہ کے ایک بزرگ شیخ ضیاء الدین رومی کا مرید ہوگیا، اور حضرت خواجہ کی دشمنی کا اظہار کھلم کھلا کرنے لگا، اس وقت ان کے لنگر خانہ کا خرچ روزانہ دو ہزار تنکہ تھا، سلطان کے بعض مفسد امراء نے اس کے کان بھرے کہ یہ تمام اخراجات اُن امراء کے نذرانے کی رقم سے پورے ہوتے ہیں۔ جو خانقاہ میں آیا جایا کرتے ہیں، سلطان نے خانقاہ میں امراء کی آمد و رفت سختی سے روک دی، مگر اس لنگر خانہ کے اخراجات پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑا، اور سارے اخراجات حسب معمول پورے ہوتے رہے، سلطان کی پرخاش اور بڑھی اور اس نے حضرت خواجہ کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا، لیکن حضرت خواجہ نے کہلا بھیجا کہ میں گوشہ میں بیٹھا رہتا ہوں، کہیں آتا جاتا نہیں، میرے بزرگوں کا بھی یہ قاعدہ نہیں تھا کہ وہ دربار میں جائیں، اور بادشاہوں کے مصاحب بنیں، اس لیے مجھکو اس سے معذور سمجھ کر معاف رکھنا چاہیے، لیکن سلطان نے اس عذر کو قبول نہیں کیا، اور غصہ میں آکر یہ اعلان کرادیا کہ جو کوئی بھی ان کا سر لائے گا، اس کو ایک ہزار اشرفی انعام میں دیجائیگی، حضرت خواجہ نے سلطان کے پیر شیخ ضیاء الدین رومی کے پاس پیام کہلا بھیجا کہ وہ اپنے مرید کو سمجھائیں کہ درویشوں کو رنج پہنچانا کسی مذہب میں روا نہیں، مگر اس پیام کے پہنچنے سے پہلے شیخ ضیاء الدین رومی کا انتقال ہوگیا، ان کی فاتحہ خوانی کے موقع پر سلطان اور اس کے اکابر امراء ان کے مزار کے پاس جمع ہوئے تو حضرت خواجہ نے بھی اس میں شرکت کی، جس وقت وہ تشریف لائے تو تمام حاضرین ان کی تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، سلطان نے یہ دیکھا تو اس کا حسد اور بھی بڑھ گیا اور محل میں جاکر اس نے حکم جاری کیا کہ ہر قمری مہینہ کی پہلی تاریخ کو جب کہ تمام ائمہ اور مشائخ دربار میں رسماً جمع ہوا کرتے ہیں تو وہ بھی حاضر ہوں، جب یہ حکم ان کے پاس پہنچا، تو صرف یہ فرمایا کہ دیکھوں گا کہ کیا ظہور میں آتا ہے، شہر کے اکابر نے حضرت خواجہ کی

خدمت میں پہنچکر ان سے عرض کیا کہ ایک نا عاقبت اندیش سلطان کی وجہ سے کوئی فتنہ پیدا ہو جائے تو دربار میں جاکر اس کو روک دینا بہتر ہے، لیکن حضرت خواجہ نے فرمایا کہ میں اپنے مرشدوں کے خلاف دستور کوئی کام نہ کروں گا، لوگوں میں بڑی سراسیمگی تھی، کہ سلطان الاولیاء اور سلطان دہلی کے تصادم سے ایک بڑی مصیبت بپا ہو جائے گی، لیکن سلطان قطب الدین جس روز دربار میں حضرت خواجہ کی آمد کا منتظر تھا، اسی روز محل کے اندر شورش ہوئی اور وہ خسرو خاں کے ہاتھوں قتل ہوا،

ان تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ یہ اختلاف بھی کسی نظری اور فکری مسئلہ پر نہ تھا، بلکہ سراسر ذاتی تھا، خسرو خاں تخت نشین ہوا تو اس نے اپنی سیہ کاریوں پر پردہ ڈالنے کی خاطر مشائخ کے پاس بھی روپے بھجوائے، حضرت خواجہ کے پاس بھی پانچ لاکھ ٹنکے پہنچے لیکن انھوں نے اسی وقت ساری رقم فقراء میں تقسیم کر دی، اور جب غیاث الدین تغلق بادشاہ ہوا تو جن لوگوں کو خسرو نے روپے دیے تھے، ان سے غیاث الدین تغلق نے واپس مانگے، اس حکم پر دوسرے مشائخ نے روپے واپس کر دیے، لیکن حضرت خواجہ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، آگے چل کر غیاث الدین تغلق نے جاہ طلب علماء کے مشورے سے ایک محضر میں حضرت خواجہ کو سماع کے جائز و ناجائز ہونے پر مناظرہ کرنے کے لیے طلب کیا، تو اس میں وہ شریک ہوئے، اور سماع کی اباحت اور حلت میں دلائل پیش کیے، اسکی تفصیل آگے آئے گی، بعض تذکرہ نگاروں اور مورخوں نے لکھا ہے کہ سلطان غیاث الدین ۷۲۴ھ میں بنگالہ کی مہم سے واپس آرہا تھا تو اس نے حضرت خواجہ کے پاس یہ پیام کہلا بھیجا کہ وہ غیاث پور سے نکل کر اس کا استقبال کریں، لیکن اس پیام کو پڑھ کر حضرت خواجہ کی زبان سے صرف یہ نکلا کہ ہنوز دلی دور است، چنانچہ غیاث الدین تغلق شہر سے تین کوس کے فاصلہ پر ایک نئی عمارت میں مقیم تھا کہ اچانک یہ عمارت رات کو

گر گئی جس کے نیچے دب کر وہ جاں بحق ہو گیا، لیکن یہ مشہور روایت محض عوام کی ہے جس کو موجودہ دور کے محققین صحیح تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں،

حضرت خواجہ نے سلاطین وقت سے ملنے سے جو گریز کیا اس سے عام طور پر یہ خیال ہوتا ہے کہ چشتیہ سلسلہ کے خواجگان بادشاہوں کی ملاقات کو دنیاوی نجاست تصور کرتے رہے، اور اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ایک بار سہروردیہ سلسلہ کے بزرگ حضرت رکن الدین دہلی سے سلطان وقت سے مل کر ملتان جا رہے تھے تو واپسی میں پاک پٹن بھی ٹھہرے اور حضرت بابا گنج شکرؒ کے پوتے حضرت علاء الدینؒ سے ملاقات کے وقت معانقہ کیا، تو آخر الذکر نے معانقہ کے بعد غسل فرمایا کہ ان میں بھی درباری نجاست لگ گئی ہے، حضرت رکن الدینؒ نے غسل فرمانے پر ان کی احتیاط کو سراہا اور اپنی ذات سے ندامت کا اظہار کیا،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا سلاطین سے نہ ملنا ان کی درویشی کے جلوۂ صد رنگ میں سے ایک تابناک جلوہ تھا، لیکن اس سے یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ یا خواجگانِ چشت بادشاہت کو ایک نجس چیز سمجھتے تھے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے سلطان شمس الدین التمش، ناصر الدین محمود اور غیاث الدین بلبن کے لیے تعظیمی الفاظ استعمال کیے ہیں، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے پھر اوپر یہ بھی ذکر آیا ہے کہ انھوں نے علاء الدین خلجی کو یہ کہلا بھیجا کہ میں بادشاہوں اور مسلمانوں کی دعاگوئی میں مشغول ہوں، ان باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ان کے معیار کے مطابق کوئی سلطان ہوتا، یا وہ اگر سلطان التمش یا ناصر الدین محمود یا غیاث الدین بلبن کے وقت میں ہوتے تو بادشاہ سے ملنے میں پرہیز نہ کرتے، کیونکہ خود ان کے سلسلہ کے اکابر بزرگ بادشاہ سے ملاقات کرنا کوئی دنیاوی نجاست تصور نہیں کرتے تھے، ایک روایت میں ہے کہ التمش نے حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ کی صحبت میں رہ کر علم لدنی اور معرفتِ باطن کے تمام رموز حاصل کیے،

اور اگر یہ روایت تسلیم نہ بھی کی جائے تو مستند تذکروں میں ہے کہ التمش سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ
کو جو روحانی لگاؤ تھا اسکی بنا پر وہ ایک بار اجمیر سے چل کر دہلی تشریف لائے اور سلطان سے ملنے
میں تامل نہ کیا، سیر الاولیاء جیسے مستند تذکرہ میں ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے صاحبزادوں
کے قبضہ میں اجمیر کے پاس ایک گاؤں تھا، وہاں کے مقطع نے لگان مقرر کرنے میں ان کو کچھ زیادہ
تنگ کیا، تو انھوں نے اپنے والد بزرگوار سے عرض کیا کہ وہ دہلی جاکر سلطان سے ایک فرمان لادیں
حضرت خواجہ نے اپنے صاحبزادوں کی خاطر دہلی کا سفر کیا، اور جب وہ اپنے مرید حضرت خواجہ
بختیار کاکیؒ کے پاس پہنچے اور ان کو اپنے مرشد کی تشریف آوری کی وجہ معلوم ہوئی تو انھوں نے
اپنے مرشد کو سلطان کے پاس جانے سے روک دیا، اور خود سلطان کے یہاں قدم رنجہ فرمایا، وہ کبھی
سلطان کے پاس نہیں گئے تھے، حالانکہ سلطان اس کا برابر متمنی رہا، سلطان اپنے مرشد کو اپنے یہاں
دیکھ کر متعجب ہوا، اور جو کچھ انھوں نے چاہا، اس نے کر دیا، یہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ التمش برابر ان کے
خلوت و جلوت میں ساتھ رہا اور رات کے وقت ان کے پاؤں بھی دابا کرتا تھا۔ فوائد الفواد اور
سیر الاولیاء میں ہے کہ سلطان ناصر الدین محمود اوچہ اور ملتان کی طرف گیا تو وہ اپنے پورے
لشکر کے ساتھ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے ملا، اور وہ بھی اس سے بڑی خوشی سے ملے، [illegible]
ہی کی، روایت ہے کہ بلبن جب سلطان ناصر الدین محمود کا وزیر تھا، تو وہ حضرت گنج شکرؒ سے جاکر ملا،
تو انھوں نے اس کے بادشاہ ہونے کی پیشین گوئی بھی کی، حضرت گنج شکرؒ کے پوتے حضرت
علاء الدینؒ ان کے سجادہ نشین ہوئے تو وہ دربار سے الگ تھلگ ضرور رہے، لیکن انھوں نے
محمد تغلق اور فیروز شاہ تغلق کو مرید بھی کیا، خود حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے سلطان علاء الدین
خلجی سے ملاقات کرنا تو پسند نہیں کیا، لیکن اس کے لڑکوں میں سے خضر خاں اور شادی خاں کو
مرید کیا، اور یہ دونوں ان کے عزیز مریدوں میں تھے، خضر خاں ہی نے خانقاہ کی عمارت بنوائی

پھر حضرت خواجہ کے سب سے محبوب مرید حضرت امیر خسرو تھے، جو جلال الدین خلجی کے مصحف دار اور
بارہ سو ٹنکے سالانہ کے وظیفہ خوار اور علاء الدین خلجی کے معزز درباری رہے، قطب الدین مبارک
خلجی کی شان میں قصیدے بھی کہتے رہے، اور اپنی مثنوی نہ سپہر کے صلہ میں اس سے ہاتھی کے برابر
روپے پائے، غیاث الدین تغلق کے ساتھ بنگال بھی گئے، اور ان آقاؤں کی فتح و تسخیر پر نثر
اور نظم میں کتابیں بھی لکھتے رہے، لیکن اس درباداری کے باوجود حضرت خواجہ نظام الدین
اولیاءؒ کو ان سے بڑا گہرا لگاؤ رہا، تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ
فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے سے تو تنگ آجاتا ہوں لیکن امیر خسرو سے کبھی تنگ نہیں ہوتا ہوں،
ایک اور موقع پر فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ جب پوچھے گا کہ دنیا سے کیا لائے تو میں
کہوں گا اس ترک اللہ (یعنی امیر خسرو) کا سوز سینہ، پھر ایک اور موقع پر فرمایا کہ
اگر شریعت میں اجازت ہوتی تو میں وصیت کرتا کہ امیر خسرو کو میری قبر میں ساتھ دفن کیا
جائے، تاکہ قبر کے اندر بھی یکجائی ہو، امیر خسرو کی زندگی کی یہ کرامت ہے کہ وہ سلاطین وقت
کے درباری اور ہمجلیس بھی تھے، اور خلوت میں اپنے مرشد کے ادنی خادم بھی رہے لیکن دونوں
میں کسی کو بھی اپنے سے آزردہ ہونے کا موقع نہیں دیا،

امیر خسرو کے درباری تعلقات قائم رکھنے میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کبھی معترض
نہیں ہوئے، لیکن اس کی بھی مثال ہے کہ وہ اپنے مریدوں کے درباری تعلقات رکھنے میں مانع
بھی ہوئے، مثلاً خواجہ موید الدین کرہ سلطان علاء الدین کی شہزادگی کے زمانے میں اس کے
جان نثاروں میں تھے، مگر ترک دنیا کر کے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے آستانے پر
جبیں سائی کرنے لگے، علاء الدین خلجی جب بادشاہ ہوا تو ایک حاجب کو حضرت خواجہ کی
خدمت میں بھیج کر پیام دیا کہ خواجہ موید الدین کو رخصت کر دیں تاکہ وہ اس کے کام میں مدد دیں،

حضرت خواجہ نے فرمایا کہ ان کو ایک اور کام درپیش ہے، اور اسی میں وہ کوشش کر رہے ہیں، شاہی حاجب کو یہ جواب گراں گزرا، اور اس نے کہا کہ مخدوم! آپ چاہتے ہیں کہ اپنا جیسا سب کو کرلیں، حضرت خواجہ نے فرمایا اپنے جیسا کیا میں اپنے سے بہتر کرنا چاہتا ہوں،

اسی طرح حضرت خواجہ شمس الدین دہاری شاہی ملازمت میں دیوان کے عہدہ پر مامور تھے، مگر اس عہدہ کو چھوڑ کر حضرت خواجہ کے مرید ہوگئے، اور ان کے ملفوظات کے کاتب بن گئے، ایک دن حضرت خواجہ سے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو آنے جانے والوں کے لیے ایک مکان بنالوں، حضرت خواجہ نے فرمایا کہ یہ کام اس کام سے جس کو تم نے چھوڑا ہے کم نہیں ہے،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے خلفاء میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ، حضرت قطب الدین منورؒ اور حضرت فخر الدین زرادیؒ نے اپنے مرشد کے مسلک کے مطابق سلاطین سے ملاقات کرنے میں گریز ضرور کیا، لیکن ان تینوں کی ملاقاتیں سلطان محمد تغلق سے ہوئیں، گو تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے نفس پر جبر کرکے اس سے ملاقات کی، حضرت نصیر الدین چراغ نے کسی بادشاہ کو اپنے حلقۂ ارادت میں تو نہیں لیا، لیکن سلطان فیروز شاہ کا لائق وزیر خانجہاں ان کا مرید تھا، اور وہ اس پر بہت مہربان رہے، اور جب اس نے ان سے عبادت و ریاضت کی تفصیل پوچھی تو انھوں نے فرمایا کہ تم وزیر مملکت ہو، تمھاری عبادت یہی ہے کہ حاجت مندوں کی حاجت برآری میں انتہائی کوشش کرو، آگے چل کر چشتیہ سلسلہ کے اکابر صوفیہ میں حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ، حضرت مجدد الف ثانی، اور حضرت شاہ فخر الدین دہلویؒ وغیرہ کی بھی ملاقاتیں سلاطین وقت سے ہوتی رہیں، اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے علاوہ چشتیہ سلسلہ کے بہت سے

بزرگوں نے بادشاہوں سے ملاقاتیں تو کیں، لیکن ان میں سے کوئی دربار میں خود سے حاضری دینا پسند نہ کرتا، بادشاہ وقت خود ان کے پاس آجاتے تو وہ ان سے ملاقات کرلیتے، لیکن ان ملاقاتوں کے باوجود سلاطین اور امراء سے تعلقات رکھنا اپنی فقیری اور گمنامی کی شان کے خلاف سمجھتے رہے، ان کے خلاط سے راحت پسندی اور تن پروری کا خطرہ محسوس کرتے تھے، اس لیے کبھی ان کا دیہہ دار یا جاگیردار بننا پسند نہیں کیا، اور نہ ان کے دفتر میں اپنا نام لکھوانا گوارا کیا، اپنی فقیری کی شان کمال استغناء ہی میں تصور کرتے رہے جس کی تفصیل آگے آئے گی،

محمد بن تغلق اور صوفیہ کا تصادم | پہلے کہا جا چکا ہے کہ محمد بن تغلق حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے پوتے حضرت علاء الدین اجودھنیؒ کا مرید تھا، اور ان کی اولادوں کو بڑے عہدوں سے نوازا، اس نے بعض مشائخ کے لیے خانقاہیں بھی بنوائیں، اور بعض کے مزارات بھی تعمیر کرائے اور ان کے لیے جاگیریں وقف کیں لیکن اسی کے ساتھ بعض تاریخوں اور تذکروں میں ہے کہ اس نے شیخ شہاب الدین بن احمد جام کی داڑھی نچوائی، اور آخر میں ان کے منہ میں گوبر ڈلوا کر ان کو ہلاک کرایا، شیخ ہود کو بھی قتل کرایا، شیخ شمس الدین بن تاج العارفین کو قید کیا، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے گلے کی ہڈیوں میں سوراخ کراکے ان کو رسیوں سے باندھنے کا حکم دیا اور ان کو قید کردیا، اسی طرح اس نے حضرت فخر الدین زرادیؒ اور حضرت قطب الدین منورؒ کو بھی ایذائیں پہنچائیں، ان واقعات کی تفصیل لکھ کر سلطان کو جابر، قاہر، سفاک، ظالم اور خونی حکمراں بنایا گیا ہے، اس کے عہد کے ایک شاعر عصامی نے تو اس کو ملحد، بے دین، اصول و فروع سے منحرف وغیرہ وغیرہ قرار دیا ہے، اور یہ بھی الزام رکھا ہے کہ اس کی بے راہ روی کی وجہ سے ملک کے مختلف حصوں میں کفر پھیلا اور اسلام کی رونق کم ہوگئی، ابن بطوطہ سلطان کے ساتھ ایک عرصۂ دراز تک رہا، اس نے سلطان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ عصامی یا اس کے ہم خیال مورخوں اور تذکرہ نویسوں کے بیان سے بالکل مختلف ہے، وہ لکھتا ہے کہ سلطان کی سخاوت، شجاعت، سختی اور خونریز

کی حکایات عوام الناس کے زبان زد ہیں، اس کے باوجود میں نے کو کسی شخص کو اس سے زیادہ متواضع اور منصف نہیں دیکھا، وہ شریعت کا پابند ہے اور نماز کی بڑی تاکید کرتا ہے، جو نہیں پڑھتا اس کو سزا دیتا ہے اور وہ ان بادشاہوں میں ہے جن کی نیک بختی اور مبارک نفسی حد سے بڑھی ہوئی ہے،

موجودہ دور کے محققین اور مورخین بھی محمد بن تغلق کو ان عینکوں سے دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن سے اس کے بعض معاصر یا عہد مغلیہ کے مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے دیکھا ہے، اور اس دور میں اس پر جتنے الزامات رکھے گئے تھے، ان کا ناقدانہ اور محققانہ تجزیہ کر کے ان کو غلط قرار دینے کی کوشش کی ہے، اسی طرح صوفیۂ کرام کی خون ریزی اور ایذا رسانی کے بعض واقعات کو بھی من گھڑت داستانیں اور کذب عوام الناس ٹھہرانے کی کوشش کی گئی ہے، موجودہ دور کے ایک مورخ جناب آغا مہدی حسین نے اپنی کتاب سلطان الہند محمد شاہ بن تغلق میں اس کی سیرت کا محققانہ جائزہ لینے کے بعد آخر میں یہ لکھا ہے کہ سلطان محمد کیا تھا، اور بنانے والوں نے اس کو کیا بنا دیا، وہ بیدار مغز، روشن ضمیر، صلح پسند، فراخ دل، مصلح، عالی حوصلہ، عالم، عادل، محقق، مجدد، مدبر، فیاض، سیر چشم، محتاط اور اصول کا پابند تھا، وفاداروں اور فرمانبرداروں کا کیا ذکر دشمنوں پر بھی مہربانی کرتا، مجرموں کے جرم کو معاف کر دیتا اور خطا کاروں کی خطاؤں کو بخش دیتا، چشم پوشی سے بھی کام لیتا، سزائیں بہت دیتا، اور خونریزیاں کرتا، مگر جو کچھ کرتا تھا کسی خاص مطلب اور مصلحت سے کرتا تھا، بدقسمتی سے اس کا مطلب پورا نہ ہونے پایا، اس نے جاہل نما عالموں کی اصلاح کرنی چاہی تھی، اور بہترین علما اور مشائخ کو ملکی عہدوں اور ذمہ داریوں پر مگر دربار کی مختلف خدمتوں پر مقرر کرنا چاہا تھا، مگر ناکام رہا، دشمنی پھیل گئی، اور مخالفت بڑھ گئی، باغیوں کی بن آئی، اور سلطان محمد کی جان پر آ بنی، آخر وہ ہلاک ہو گیا، اس کے مرتے ہی سلطنت پر ان علما کا اثر قائم ہو گیا جن کی اصلاح میں سلطان محمد اتنے عرصہ سے کوشاں تھا، اسی اثر کے تحت میں ایک تحریک ہوئی جس کی بنا پر سلطان کے ظلم اور اس کی خونریزیاں باقاعدہ لکھی گئیں،

(باقی)

شاہ محمد غوث گوالیاریؒ

از

جناب پروفیسر مسعود احمد صاحب حیدرآباد سندھ

(۳)

سفر گجرات، واقعہ تکفیر اور بیعت شاہ وجیہ الدین علوی

۹۴۷ھ میں جب کہ افغانان سور کا غلبہ ہو گیا تھا، شاہ محمد غوث گوالیار سے ہجرت فرما کر گجرات تشریف لے آئے تھے[1]، ملا عبد القادر بدایونی (متوفی ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء) نے بھی لکھا ہے:-

"بعد از فترات ہند چوں شیر شاہ در مقام آزار شیخ محمد شد، سفر گجرات اختیار نمودہ وحکام و سلاطین آنجا نیز در ربقۂ انقیاد او داخل گردیدند تمام در مقام خدمت بودند"[2]۔

شیخ محمد غوث نے بھی، جواہر خمسہ (۹۲۹ھ) میں اس طرف اشارہ کیا ہے:-

"بعد از چند سال از روئے قضا و قدر، بہ ولایت گجرات رسید"[3]۔

شاہ محمد غوث ۹۲۹ھ کے لگ بھگ گوالیار تشریف لائے تھے اور ۹۴۷ھ میں یہ ہجرت واقع ہوئی تھی[4]۔ نصیر الدین محمد ہمایوں (متوفی ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء) نے بھی اپنے مکتوب میں اس طرف اشارہ کیا ہے، "شاہانِ ہند سے تعلقات" کے ذیل میں مکتوب نقل کیا جا چکا ہے،

---

[1] محمد غوثی: گلزار ابرار (اردو) مطبوعہ ۱۳۲۶ھ ص ۲۹۲ [2] عبد القادر بدایونی: منتخب التواریخ ج ۳ ص ۵ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء و رحمان علی: تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۶۴ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء [3] محمد غوث گوالیاری: جواہر خمسہ (دیباچہ) مطبوعہ دہلی ۱۳۲۵ھ [4] محمد غوث: اوراد غوثیہ، ص ۶، مطبوعہ مطبع صبغۃ اللّٰہی ۱۳۱۳ھ

شاہ محمد غوثؒ پر شیر شاہ نے غالباً اس لیے عتاب کیا کہ آپ کا تعلق ہمایوں بادشاہ سے تھا، اس کے علاوہ بعض حاسدوں نے آپ کی تصنیف معراج نامہ شیر شاہ کے سامنے پیش کی اور یہ کہا کہ اس میں بہت سی خلاف شرع باتیں ہیں، اس پر وہ اور غضب ناک اور آپ کی ایذا رسانی کے درپے ہوگیا اور آپ مجبوراً ہجرت کر کے گجرات تشریف لے آئے، مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی یہی لکھا ہے،

"وے در حالت عروج حال خویش کتاب موسوم بہ معراج نامہ تصنیف کردہ بود، دراں کتاب مقامات حال عروج خود درج کردہ، چوں بادشاہ ہمایوں معزول الریاست گشت و از ہند بہ طرف ایران رفت، حاسداں معراج نامہ شیخ رانزد شیر شاہ بادشاہ بردند و بہ عرض رسانیدند کہ وے دریں کتاب کلمات خلاف شرع تحریر فرمودہ است، شیر شاہ درپے آزار وے شد، پس شیخ از گوالیار بہ گجرات رفت۔"[1]

شاہ محمد غوث جب گجرات تشریف لے آئے تو یہاں علماء نے معراج نامہ کے مندرجات پر ایک طوفان برپا کر دیا اور آپ کے قتل کے درپے ہوگئے، مفتی غلام سرور لاہوری نے اس کا حال بھی لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"علمائے گجرات ہم بہ عداوت وے برخاستند، محضرے نوشتہ معتقد قتل وے شدند دراں حال شیخ وجیہ الدین گجراتی کہ سر دفتر علماء و صلحاء و مشائخ گجرات بود و بخدمت شیخ ارادت ہم داشت بہ عرض رسانید کہ چوں مجلس علماء منعقد شود و سخن در معراج افتد شیخ بفرمائید کہ ایں معراج مراد در عالم واقعہ بوقوع آمدہ ست نہ در ہوش و بیداری۔ غرض چوں معرکہ علماء درمیان آمد شیخ فرمود کہ ایں معراج عالم بیہوشی ست کہ از ظاہر خبر نداشتم ازیں سبب علماء از آزار شیخ در گذشتند۔"[2]

[1] مفتی غلام سرور لاہوری: خزینۃ الاصفیاء، مطبوعہ لکھنؤ، ص ۴-۳۳۲ ۱۸۷۳ء [2] ایضاً

ملا عبد القادر بدایونی نے اس واقعہ کو دوسرے انداز سے لکھا ہے، وہ شیخ کے ہمعصر ہیں، اس لیے ان کا بیان زیادہ مستند ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"جب سلطان محمود گجراتی کے زمانے میں شیخ محمد غوث ہندوستان سے گجرات گئے تو شیخ علی متقی نے جو مشائخ کبار اور اپنے وقت کے علماء روزگار میں تھے، ان کے قتل کا فتویٰ دیا، سلطان نے اس کا اجرا، میاں وجیہ الدین کی رائے پر موقوف کر دیا، چنانچہ میاں وجیہ الدین شیخ کی ملاقات کو گئے، اور پہلی ہی ملاقات میں ان کے ایسے معتقد ہوئے کہ بے اختیار ہوگئے اور اس فتویٰ کو پرزے پرزے کر ڈالا، یہ سن کر شیخ علی متقی ان کے مکان پر گئے، اور ان سے کہا تم کیوں بدعت کے رواج پر راضی ہوگئے؟ شرع میں رخنہ ڈالتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا، ہم ارباب قال ہیں اور شیخ اہل حال، ہمارا ذہن ان کے کمالات کو نہیں سمجھ سکتا اور ظاہر شریعت میں کوئی اعتراض ان پر نہیں آتا، غرض ان کے اثر سے تمام گجرات کے حکام شیخ محمد غوث کے معتقد ہوگئے اور شیخ نے اس بلا سے نجات پائی۔"[1]

شیخ وجیہ الدین علوی، شاہ محمد غوث سے اتنے متاثر ہوئے کہ شرف بیعت حاصل کر لیا، اس کی تفصیل شاہ محمد غوث کے خلفاء کے ذیل میں بیان کی جائے گی۔

ملا عبد القادر بدایونی نے لکھا ہے:-

"و میاں شیخ وجیہ الدین عالم ربانی متبحر درس، غاشیہ اطاعت او را بر دوش کشیدہ و ایں جملہ دال بر کمالات و کرامات شیخ است۔"[2]

شیخ وجیہ الدین علوی کوئی معمولی عالم نہ تھے، اپنے عہد کے جلیل القدر علماء میں ان کا شمار کیا جاتا تھا، بلکہ اگر سر آمد علماء کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا، سکندر بن محمد نے مرات سکندری میں جہاں سلطان

[1] ملا عبد القادر بدایونی: منتخب التواریخ (اردو) ص ۵-۴۴۴ مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۸۹ء
[2] منتخب التواریخ (فارسی) جلد سوم مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء

محمود گجراتی کے ہمعصر علماء کا ذکر کیا ہے وہاں شاہ محمد غوثؒ کے بعد شیخ وجیہ الدین کا ذکر کیا ہے اور ان القاب کے ساتھ

"اعلم العلماء، افضل الفضلاء، جامع المنقول والمعقول، حاوی الفروع والاصول کاشف اسرار وجود، ناظر انوار شہود، بندگی میاں وجیہ الدین علوی۔"[1]

دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں شاہ محمد غوثؒ کے سفر گجرات اور شیخ وجیہ الدین علوی کے واقعہ بیعت کو بڑے مبہم انداز سے بیان کیا گیا ہے، اس کی اصلاح ضروری ہے، مقالہ نگار نے لکھا ہے:-

"کوہستان چنار میں تیرہ برس سے زیادہ ریاضت و مجاہدے کے بعد (شاہ محمد غوث) گجرات تشریف لائے جہاں آپ مشہور و معروف عالم اور صوفی شیخ وجیہ الدین گجراتی سے آشنا ہوئے۔" (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، مطبوعہ لیڈن (ہالینڈ) ج ۳ ص ۲۸۷-۸، ۱۹۱۳ء)

شاہ محمد غوثؒ کوہستان چنار میں، ریاضت و مجاہدے کے بعد ۹۲۹ھ کے لگ بھگ گوالیار تشریف لائے، پھر شیر شاہ سوری کے ناروا سلوک سے خاطر برداشتہ ہو کر ۹۴۷ھ میں گجرات تشریف لے گئے، وہاں واقعہ تکفیر، شیخ وجیہ الدین علوی کی بیعت و خلافت کا ذریعہ بن گیا، یہ واقعہ شاہ محمد غوثؒ اور شیخ وجیہ الدینؒ کی زندگی کا بڑا اہم واقعہ ہے، مگر فاضل مقالہ نگار نے بے حد اختصار سے کام لیا ہے،

بعض ماخذوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ محمد غوثؒ گوالیار سے دہلی تشریف لے گئے، پھر وہاں سے گجرات آئے، اور یہاں سے اکبرآباد بھی تشریف لے گئے، مولانا شیر علی بنگالی تحریر فرماتے ہیں:-

"جب غوث الاولیاء، آسودگان دہلی کی زیارت کے واسطے دہلی تشریف لائے تھے اس وقت آپ کی بیعت سے مشرف ہوا، اور آپ کی خدمت میں حاضر رہا، اور جب آپ کو

[1] سکندر بن محمد — مرآت سکندری، ص ۳۳۶ مطبوعہ بمبئی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء

گجرات کا سفر پیش آیا تو ہمراہ تھا، احمد آباد کے بعض کوتہ اندیش عالم اور چھوٹی نظر والے خرقہ پوش آپ کے ساتھ دشمنی کا بہانہ ڈھونڈھنے لگے اور نادانستہ و نافہمیدہ باتیں آپ کے متعلق کہنے لگے۔"[1]

بقول تکملہ نگار مناقب غوثیہ، شاہ محمد غوثؒ تقریباً ۱۸ سال (۹۴۷ھ تا ۹۶۵-۶ھ) گجرات میں مختلف مقامات پر رہے، جن میں قابل ذکر چاپانیر، بھروچ اور احمد آباد ہے، احمد آباد میں آپ نے ایک مسجد و خانقاہ تعمیر کرائی تھی، اس کے اتمام کی تاریخ یہ ہے:-

حضرت غوث جہاں، شیخ محمد خطیر — مظہر اسرار حق، معدن سر ہدی
کعبۂ صدق و صفا، قبلۂ اہل فیوض — ساخت چوں بہر خدا مسجد حاجت روا
مسجد ضو بخش در دل عباد از ان — سال بنایش بگو معبد اہل ضیاء (۹۶۳ھ)

گجرات کے اٹھارہ سالہ قیام نے شاہ محمد غوثؒ کا حلقۂ اثر بہت وسیع کر دیا تھا، سلاطین گجرات میں سلطان محمود ثانی آپ کا عقیدت مند تھا، حضرت شاہ وجیہ الدین جیسے عالم ربانی و فاضل متبحر آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے، اور گجرات و دکن و مالوہ وغیرہ کے علماء و فضلاء نے اس سلسلہ کو آپ سے حاصل کیا، گجرات و دکن میں یہ سلسلہ بہت ترقی پذیر ہوا۔"[2]

سفر اکبرآباد — گجرات میں اٹھارہ انیس سال گزارنے کے بعد شاہ محمد غوثؒ ۹۶۶ھ / ۱۵۵۸ء میں اکبرآباد تشریف لائے، ملا عبد القادر بدایونی (متوفی ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء) لکھتے ہیں:-

"۹۶۶ھ میں شیخ مشار الیہ (محمد غوثؒ) اپنے مریدین اور معتقدین کے ساتھ بڑے کروفر سے گجرات سے آگرے تشریف لائے، شہنشاہ (اکبر) عقیدت مندانہ پیش آیا، شیخ گدائی کو تنگ نظری اور نفاق و حسد کی وجہ سے، جو ایلۂ ہند کا لازمۂ حیات ہے، (شیخ محمد غوث

[1] محمد ظہیر الحق احمد آبادی: تتمہ مناقب غوثیہ ص ۶۵-۶۶ مطبوعہ آگرہ ۱۹۳۳ء

[2] محمد ظہیر الحق احمد آبادی: تتمہ مناقب غوثیہ (اردو) ص ۶۳

کا آنا اور ان کی دکان پر دکان لگانا گخت نہ بھایا ؎

به نزد خرد این سخن روشن است

که هم پیشه، هم پیشه را دشمن است

خان خاناں کو بھی جس طرح شیخ سے پیش آنا چاہیے تھا، پیش نہ آیا، کیونکہ شیخ گدائی نے اس کے مزاج میں پورا رسوخ پیدا کر لیا تھا، بلکہ اس نے تو مختلف مجالس منعقد کر کے شیخ محمد غوث کے رسالہ کو سامنے رکھا اور کہا کہ شیخ نے اس میں اپنی معراج کی کیفیت بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ مجھکو بیداری میں حضرت رب العزت شانہ سے مجالسہ و مکالمہ ہوا ہے، اور اس طرح حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی تقدیم کی ہے، اسی قسم کی اور خرافات جو عقلاً و نقلاً قابل ملامت اور مذموم ہیں، مجالس میں شیخ کی طرف منسوب کی گئیں، شیخ کو اس میں گھسیٹ کر نشانۂ تیر ملامت بنایا گیا، یہانتک کہ شیخ محمد غوث آزردہ خاطر ہو کر گوالیار تشریف لے گئے۔ اور وہاں سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا اور جو ایک کرور کی جاگیر عطا کی گئی تھی اسی پر قناعت کی۔" (منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۵، ۳۴۴ و ۳۵)

عبد القادر بدایونی نے شاہ محمد غوث کی بھی زیارت کی تھی، چنانچہ انھوں نے ان کے چشم دید حالات اسطرح بیان کیے ہیں:-

"۹۶۶ھ میں فقیر نے آگرے کے بازار میں دور سے (شیخ محمد غوث کو) دیکھا تھا (گھوڑے پر) سوار تشریف لے جا رہے تھے، اور چاروں طرف لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ وہاں سے کسی کا گزرنا محال تھا، بڑے تواضع و انکسار کے ساتھ دائیں بائیں لوگوں کے سلام کا جواب دیتے جاتے تھے، اور ایک لحظہ بھی چین و قرار نہیں تھا، تواضع کا یہ عالم تھا کہ آپ کی خمیدہ کمر قابوس زین تک جا پہنچتی تھی، سنہ مذکور میں آپ گجرات سے آگرے تشریف لائے تھے۔"
(ترجمہ)

تاریخ فرشتہ نے جہاں شاہ محمد غوث کا ذکر کیا ہے، وہیں آگرہ میں آپ کی آمد اور آزردہ خاطر ہو کر گوالیار کی مراجعت کا بھی ذکر کیا ہے، اس نے لکھا ہے کہ بیرم خاں نے شاہ محمد غوث کے ساتھ جو سرد مہری اور معاندانہ رویہ اختیار کیا اس سے اکبر بادشاہ کو بڑا افسوس ہوا اور وہ بیرم خاں سے بیحد آزردہ ہوا، چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے:-

درماہ رجب آں سال (۹۶۶ھ) شیخ محمد غوث برادر شیخ بہلول (بھول) کہ حق خدمت برآں دودماں داشت و بوقت استیلائے افغاناں بہ گجرات رفتہ بود، دریں وقت با فرزنداں و مریداں بدرگاہ آمد و چوں از بیرم خاں گوشۂ خاطرے ندید باز بہ گوالیار کہ مسکن قدیم او بود، رفت، خاقان اکبر بر سر ایں مقدمہ از بیرم خاں ترکمان بغایت آزردہ شد

بیت

بے سلطاں معشوقاں غیور است

ز شرکت ملک معشوقیش دور است[1]

دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار نے شاہ محمد غوث کے حالات کے ذیل میں بعض باتیں غیر واضح اور بعض باتیں غلط لکھ دی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ

"۹۶۶ھ (۱۵۵۸ء) میں جب آپ (شیخ محمد غوث) آگرے تشریف لے گئے، جہاں اکبر نے آپ کے ساتھ سرد مہری کا برتاؤ کیا"[2]

ملا عبد القادر بدایونی اور فرشتہ کے جو بیانات اوپر نقل کیے گئے ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آگرے میں شیخ گدائی اور بیرم خاں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے شاہ محمد غوث نے گوالیار مراجعت کی تھی، اکبر کو آزردہ خاطر ہو کر آپ کے واپس جانے کا بڑا قلق تھا، اسی وجہ سے وہ بیرم خاں سے آزردہ ہو گیا تھا، اگر اکبر ناخوش ہوتا تو خزانہ شاہی سے شاہ محمد غوث کو جو وظیفہ ملتا تھا اور حکومت کی طرف سے جو

---

[1] محمد قاسم ہندو شاہ استرآبادی = تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۴۸ مطبوعہ بمبئی ۱۲۴۷ھ / ۱۸۳۲ء [2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مطبوعہ لائیڈن ۱۹۱۳ء ج سوم، ص ۸۰، ۶۸۷

جاگیریں عطا کی گئی تھیں، وہ بند ہو جائیں، اس سلسلے میں ہم نے ملا عبد القادر بدایونی، صاحب مآثر الامراء اور صاحب ذخیرۃ الخوانین کے بیانات اوپر نقل کر دیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں کی جاگیر اور لاکھوں کا وظیفہ تھا، اکبر کی عقیدت شاہ محمد غوثؒ کی حیات تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ وفات کے بعد آپ کے مزار مبارک پر اکبر نے شاندار مقبرہ بھی تعمیر کرایا، جس کا مفصل ذکر آگے آئیگا، اس کی تعریف میں اسمتھ نے لکھا ہے:

"اس عہد کی ممتاز ترین یادگاروں میں شاہ محمد غوث کا مقبرہ ہے، گو کہ وہ مقابلۃً زیادہ مشہور و معروف نہیں" (وی، اے اسمتھ: اکبر دی گریٹ مغل، ص ۴۳۵، مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۱۹ء)

شاہ محمد غوث نے اکبر آباد سے گوالیار پہنچنے کے بعد ایک خانقاہ تعمیر کرائی اور بیعت و ارشاد میں مشغول ہو گئے، ملا عبد القادر بدایونی لکھتے ہیں

"رنجیدہ بہ گوالیار رفت و بہ تکمیل مریدان مشغول شد و خانقاہے تعمیر فرمودہ بہ سماع و سرود و وجد و اشتغال داشت و خود دوران وادی تصنیف و در کسوت فقر بسیار صاحب جاہ و جلال بود و یک کرور تنکہ مدد معاش داشت"[1]

بدایونی کے ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ محمد غوث اکبر آباد سے گوالیار جانے کے بعد پھر تشریف نہیں لائے لیکن وفات کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:-

"در سنہ نہصد و ہفتاد (۹۷۰ھ) بعد از ہشتاد سالگی در آگرہ رحلت بدار الملک آخرت نمودہ و در گوالیار مدفون شد"[2]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پھر اکبر آباد تشریف لائے تھے، اور آخر وقت تک یہیں رہے ۹۶۶ھ/۱۵۵۸ء میں جب پہلی مرتبہ آپ اکبر آباد تشریف لائے تو بیرم خاں حیات تھا، اور (۹۶۷ھ/۱۵۵۹ء) میں اسی کو

[1] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۶

شہید کر دیا گیا تھا، اس سے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ۹۶۷ھ/۱۵۵۹ء اور ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء کے درمیان شاہ محمد غوث دوبارہ اکبر آباد تشریف لائے، کیونکہ اکبر آپ سے بہت متاثر تھا، بلکہ بیعت و عقیدہ رکھتا تھا،

وفات

شاہ محمد غوث گوالیاری ۷ رجب المرجب ۹۰۷ھ[1] میں ظہور آباد (غازیپور) میں پیدا ہوئے، اور ۱۴ رمضان المبارک ۹۷۰ھ میں اکبر آباد میں وفات پائی اور گوالیار میں مدفون ہوئے،

مفتاح التواریخ میں ہے:-

غوث گوالیاری، مرشد شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی ست، بتاریخ چہاردہم رمضان نہصد و ہفتاد ہجری فوت کردہ، در گوالیار مدفون گردیدہ۔ (ص ۲۵۲)

مخبر الواصلین میں جو قطعہ تاریخ وفات ہے، اس میں ان دو شعروں میں تاریخ و سنہ وفات کا ذکر کیا ہے:-

از مہ صوم بود چہاردہم　　کہ گزشت از زمانہ غوث امم
سال نقلش بتعمیہ رضوان　　غوث بے لوث زد رقم برخوان
　　　　　　　　　　　　　۱۵۰۶ - ۵۳۶ = ۹۷۰ھ

مخبر الواصلین میں یہ قطعہ تاریخ وفات بھی ہے:-

آں شیخ محمد المخاطب　　بالغوث بلطف معبود
تاریخ وصال او ملائک　　گفتند کہ شیخ اولیاء بود
　　　　　　　　　　　　　۹۷۰ھ

تھامس ولیم بیل نے سنہ وفات تو ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء لکھا ہے مگر تاریخ وفات ۱۴ رمضان المبارک کے بجائے ۱۴ محرم لکھدی ہے[2]، غالباً بیل کا ماخذ نظامی بدایونی کی قاموس المشاہیر ہے، نظامی نے جو کچھ لکھا ہے، بیل نے ہو بہو نقل کر دیا ہے، اس نے لکھا ہے:-

۱۴ ستمبر ۱۵۶۲ء مطابق ۱۴ محرم ۹۷۰ھ کو وصال ہوا، شیخ اولیاء بود

[1] محمد غوث گوالیاری: اوراد غوثیہ ص ۴۵ [2] ولیم بیل: اورینٹل بائیوگرافیکل ڈکشنری ص ۱۸۶، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۱ھ

ے تاریخ وفات (۹۷۰ھ) نکلتی ہے،[1]

ہرمن ایتھے نے لکھا ہے :-

"غالباً ۹۷۰ھ مطابق ۱۵۶۲-۳ء میں انتقال فرمایا۔"[2]

معلوم نہیں سنہ وفات کے ساتھ لفظ "غالباً" لکھ کر کیوں مشکوک بنا دیا، جب کہ جملہ معاصرین کا اس پر اتفاق ہے کہ ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء میں آپ کی وفات ہوئی،

مناقب غوثیہ (۹۴۹ھ) کے تکملہ نگار نے یہ قطعۂ تاریخ نقل کیا ہے :-

شیخ دوراں غوثِ انس وجاں محمد غوثؒ — شد بہ سال نہصد و ہفتاد در جنت خرام

عرس او خواہی بہ دل کن یاد این مصراع را — نیم شب از جمعہ بود و نصف از ماہ صیام[3]

تاریخ ولادت (۱۰ رجب ۹۰۶ھ) اور تاریخ وفات (۱۴ رمضان ۹۷۰ھ) کے لحاظ سے عمر شریف تریسٹھ سال دو ماہ سات یوم ہوتی ہے، عمر کے تعین کے سلسلے میں عبد القادر بدایونی سے فاحش غلطی ہوئی ہے، حالانکہ انھوں نے شاہ محمد غوث کو ۹۶۶ھ/۱۵۵۸ء میں بچشم خود اکبر آباد میں دیکھا تھا، لیکن چونکہ غوث الاولیاء کی کمر خمیدہ اور جسم بہت ضعیف نظر آرہا تھا، اس لیے بدایونی نے یہ قیاس سے ۸۰ سال عمر لکھ دی، وہ لکھتے ہیں :

"ودر سنہ نہصد و ہفتاد (۹۷۰ھ) بعد از ہشتاد سالگی در آگرہ رحلت بدار الملک آخرت نمود و در گوالیار مدفون شد۔"[4]

دارا شکوہ نے بھی سفینۃ الاولیاء میں بدایونی کے بیان کو نقل کر دیا ہے کہ شاہ محمد غوث نے "اسی سال کی عمر پائی"[5]

---

[1] نظامی بدایونی: قاموس المشاہیر ج ۲ ص ۱۹۸ مطبوعہ بدایوں ۱۹۲۶ء [2] ہرمن ایتھے: "کیٹلاگ آف دی پرشین مینوسکرپٹس ان دی لائبریری آف انڈیا آفس" ج اول ص ۴۳، مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۰۳ء [3] تکملہ مناقب غوثیہ ص ۸، [4] ملا عبد القادر بدایونی: منتخب التواریخ، ج ۲ ص ۶ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء [5] دارا شکوہ: سفینۃ الاولیاء (اردو) ص ۲۳۰ مطبوعہ لاہور۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی بدایونی پر اعتماد کر کے لکھا ہے کہ "مدت عمرش ہشتاد سال"[1] مگر دارا شکوہ اور مفتی غلام سرور نے تاریخ وفات ۱۵ رمضان المبارک لکھی ہے ۔۔۔ ڈاکٹر عبد الحق صاحب نے بدایونی کی تقلید میں شاہ محمد غوثؒ کی عمر ۸۰ سال لکھی ہے[2]، شیخ محمد اکرام نے بھی یہی لکھ دیا ہے[3] غرض ایک معاصر کی قیاس آرائی سے پورے کا پورا سلسلہ غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا، اگر خود شاہ محمد غوثؒ کے بیانات سامنے نہ ہوتے تو صحیح عمر کا معلوم کرنا مشکل ہو جاتا،

دوسرا مسئلہ جائے وفات کا ہے، اس سلسلے میں بھی لوگوں نے غلطیاں کی ہیں، دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگار نے لکھا ہے :-

"بالآخر آپ گوالیار تشریف لے آئے جہاں ۹۷۰ھ (۱۵۶۲ء) میں آپ کی وفات ہوئی۔" (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۳ ص ۸-۶۸۷، ۱۹۱۳ء)

مگر اس سلسلے میں عبد القادر بدایونی کا بیان مستند سمجھا جائیگا کیونکہ شاہ محمد غوث کا انتقال ان کی حیات میں ہوا، اور جیسا کہ اوپر تحریر کیا جا چکا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ شاہ محمد غوث کا انتقال اکبر آباد میں ہوا، اور لاش مبارک گوالیار لیجائی گئی اور یہیں دفن کیا گیا،

مزار مبارک پر اکبر بادشاہ کی طرف سے شاہ محمد غوثؒ کے صاحبزادے شیخ عبد اللہ (متوفی ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء) کی نگرانی میں شاندار مقبرہ تعمیر ہوا، محمد غوثی نے لکھا ہے :-

"اس زمانہ میں شہنشاہ زماں اکبر شاہ کو منظور ہوا کہ روضۂ غوثیہ کی عمارت دولت کی طرف سے تیار کی جاوے۔" (محمد غوثی: گلزار ابرار (اردو) ص ۴۸۸)

اور بقول صاحب کلیات گوالیار :-

"برائے مدد خرچ مقبرہ جاگیر از پرگنات .... قریب سہ لک وبست وپنج ہزار روپیہ (۳۲۵۰۰۰)

---

[1] خزینۃ الاصفیاء، ص ۴۴۳ [2] مولوی عبد الحق مرحوم: اردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۳۵، مطبوعہ کراچی ۱۹۵۳ء

جد امقرر کردہ" (کلیات گوالیار بحوالہ مضمون قاضی معراج الدین دھولپوری)

مولوی ذکاء اللہ مرحوم نے مدد معاش اور مصارف روضۂ شریف کے لیے پانچ لاکھ روپیہ کی جاگیر لکھی ہے۔

شاہ محمد غوث کے احاطہ میں دربار اکبری کے مشہور مطرب تان سین کا بھی مزار ہے، اور حکومت ہند کی طرف سے اس کا بھی باقاعدہ عرس ہوتا ہے۔[1]

شاہ محمد غوث کے مقبرے کی عمارت اکبری عہد کی ممتاز یادگاروں میں ہے، وی، اے اسمتھ نے اس عمارت پر مفصل تبصرہ کیا ہے، ہم یہاں اس کا بیان نقل کرتے ہیں، جس سے مقبرہ کی شان و عظمت کا پورا پورا اندازہ ہو سکے گا، اسمتھ نے لکھا ہے:۔

---

[1] سید حسام الدین راشدی نے مقالات الشعرا کے حاشیہ میں میاں تان سین کے حالات درج کیے ہیں، ہم وہیں سے فارسی عبارت کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:۔

"ترلوچن داس بن مکرند پانڈی، گور برہمن کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، مضافات گوالیار میں موضع بھینٹ میں پیدا ہوا تھا،

فن موسیقی میں مہارت کے بعد اس کا نام میاں تان سین ہو گیا تھا، شیخ محمد غوث گوالیاری (متوفی ۹۷۰ھ) کی دعاؤں کے طفیل ۹۳۶ھ یا ۹۳۸ھ میں پیدا ہوا،

شیخ محمد غوث کے حضور میں اس نے تربیت پائی اور استادان فن موسیقی سے یہ فن حاصل کیا اور اس قدر کمال حاصل کیا کہ بقول ابوالفضل ہزار سال میں اس کا مثل پیدا نہیں ہوا، ابتدا میں راجہ رام چند والی باندھو (ریواں) نے اس کو اپنے دربار میں رکھا، اس کے بعد راجہ بیربر اور زین خاں کی تحریک سے ۹۷۰ھ میں اکبر نے اس کو اپنے دربار میں طلب کر لیا، وہاں اس نے وہ کار ہائے نمایاں کیے کہ اب تک اس کا نام زندہ ہے، آخر ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔

(حاشیہ مقالات الشعرا مولفہ میر شیر علی قانع تتوی، مطبوعہ کراچی ۱۹۵۷ء ص ۲-۱۴۱ بحوالہ رسالہ آجکل (دہلی) موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء)

"اس عہد کی ممتاز ترین یادگاروں میں گوالیار میں شاہ محمد غوث کا مقبرہ ہے، گو کہ یہ متقابلتاً زیادہ معروف نہیں، یہ عمارت مقبرہ ہمایوں (دہلی) کے قریبی زمانے میں تعمیر ہوئی ہے، لیکن اس کا ڈیزائن بالکل انوکھا ہے، کچھ بعید نہیں اگر کوئی شخص اس کو خالص ہندوستانی یادگار سمجھ لے،

یہ عمارت مربع ہے، ہر طرف سے ۱۰۰ فٹ ہے، ہر کونے پر ایک زاویہ کے ساتھ مسدس برج بنے ہوئے ہیں، حضرت مقبرہ کا ہال ۴۳ مربع فٹ ہے، اس کے چاروں طرف برآمدہ ہے، یہ غیر معمولی بڑے بڑے چھجوں سے محفوظ ہے،

باہر کا حصہ پہلے ایرانی طرز کے نیلے چمکدار ٹائلوں سے ڈھکا ہوا تھا، گنبد پٹھانی طرز کا قدرے اونچا ہے، اور اطراف سے قدرے فاصلے پر ترچھا ہے بعض Kiosks مسلم طرز کے ہیں لیکن بعض کے مربع ستون ہیں اور دیوار گیری نما اس عمود ہیں جو ہندو وں کے مندر کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں،

ہند و مسلم طرز تعمیر کا یہ خالص امتزاج محض مقامی حالات کی بنا پر ہے، اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں اسلام اور ہندو مت کو ہم آہنگ کرنے کی نظری سعی کی گئی ہے، اور یہ کہنا بھی مناسب نہ ہوگا کہ اس عمارت کی تعمیر پر اکبر کی رائے اثر انداز ہوئی ہوگی، کیونکہ جب یہ عمارت بنی ہے اس وقت شہنشاہ بڑا پر جوش مسلمان تھا۔"[1]

اسمتھ کا خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ "مقبرۂ غوث الاولیاء میں ہند و مسلم طرز تعمیر کے امتزاج کی عمداً کوشش کی گئی ہے یا اس میں اکبر کی رائے شامل نہیں تھی، بلکہ یہ امتزاج مقامی حالات کا نتیجہ ہے"۔ "کیونکہ ابتدائی دور میں اکبر پر جوش مسلمان تھا"۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ اکبر

---

[1] وی، اے اسمتھ: اکبر دی گریٹ مغل ص ۶-۴۳۵

اپنے ابتدائی دور میں ایک سرگرم اور پرجوش مسلمان تھا، مگر وہ ہندو کش یا ہندو دشمن نہیں تھا، بلکہ اس وقت بھی ہندو دوستی اور رواداری اس میں پوری طرح موجود تھی، چنانچہ ۹۷۰ھ ۱۵۶۲ء میں جب وہ اجمیر حاضر ہوا ہے تو واپسی میں جے پور کے راجہ بہاری مل کی لڑکی سے اس نے شادی بھی کی ہے،

اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مقبرے کی تعمیر اکبر کی فرمائش پر شاہ محمد غوث کے فرزند رشید شیخ عبد اللہ کی نگرانی میں ہوئی ہے،

خود صاحب مزار شاہ محمد غوث کی رواداری اور وسعت قلبی کا یہ عالم تھا کہ مسلمان تو مسلمان ہندوؤں کے لیے بھی تعظیماً کھڑے ہو جایا کرتے تھے، عبد القادر بدایونی لکھتے ہیں:-

"ہر گرامی دید حتی کہ کفار را نیز تعظیم و قیام می نمود و ازیں جہت اہل فقرا ند کے بملامت وانکار او برخاستند والغیب عند اللہ — تا چہ نیت داشتہ باشد۔ بیت:

چوں رد و قبول ہمہ در پردۂ غیب ست — زنہار کسے را نہ کنی عیب کہ عیب ست[1]

شاہ محمد غوثؒ کے تواضع اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ زندگی میں کبھی اپنے لیے لفظ "میں" استعمال نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ خود کو "فقیر" سے تعبیر کیا کرتے تھے، اگر کسی کو غلہ بخشش فرماتے تو اس وقت بھی لفظ "من" استعمال نہ کرتے تھے، بلکہ فرماتے کہ اتنے "میم" "نون" فلاں شخص کو ہدیہ کر دیا جائے۔

عبد القادر بدایونی لکھتے ہیں:-

"می گویند کہ ہرگز لفظ "من" بزبان او نگذشتے و ہمیشہ تعبیر از خود بہ "فقیر" کردے۔ چنانچہ در وقت بخشش غلہ ہم می گفت کہ ایں قدر میم و نون بہ فلانے بہ ہدیہ تا من نبایستے گفت، رحمۃ اللہ علیہ و اسعۃ"[2]

---

[1] منتخب التواریخ جلد ۳ ص ۶ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء [2] ایضاً

مندرجہ بالا واقعات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مقبرے کی تعمیر میں مقامی حالات و اثرات کے ساتھ جو ایک فطری امر ہے، اکبر کی رائے کو بھی بڑا دخل تھا، اور جس طرح اکبر اور شاہ محمد غوثؒ زندگی بھر روادار رہے، اسی طرح یہ مقبرہ بھی ان کی رواداری کا آئینہ دار ہے، یہ محض حسن اتفاق نہیں بلکہ عمداً اس امتزاج کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ اہل وطن کے ساتھ یکجانگت نمایاں ہو،

لفٹنٹ کرنل سر ولزلے ہیگ نے بھی شاہ محمد غوثؒ کے مقبرے کے متعلق اظہار خیال کیا ہے، ان کے اور اسمتھ کے خیالات ملتے جلتے نظر آتے ہیں، اس نے لکھا ہے:-

"اسی زمانے میں کچھ فاصلے پر گوالیار کے ہندو ماحول میں محمد غوث کا مقبرہ تیار کیا جا رہا تھا، یہ عمارت اپنے غیر معمولی ڈیزائن کی وجہ سے بعض دلچسپیاں رکھتی ہے، یہ اس مسلم صوفی کے مزار مبارک پر بنائی گئی ہے جس کا ابتدائی مغل عہد میں بہت چرچا تھا۔ اس عمارت میں "لودھی" طرز تعمیر کی خصوصیات کی آمیزش ہے، یہ خصوصیات مغربی ہند کی عمارات میں پسند کی جاتی ہیں، اس میں شک نہیں کہ یہ امتزاج مقامی معماروں کی فنکاری کا نتیجہ ہے، ان لوگوں کے سامنے اپنے مسلم آقاؤں کی پسند کی بہ نسبت مالوہ کی تعمیری خصوصیات اور نمونے ہوتے تھے، اس عمارت میں مغل اور مالوہ طرز تعمیر کے امتزاج کا فقدان ہے، کیونکہ یہ اتحادی امتزاج ابھی پیدا نہیں ہوا تھا، شہنشاہ اکبر کی رواداری کی پالیسی کے تحت بعد میں یہ امتزاج پیدا ہوا، بایں ہمہ اس عمارت میں بعض ممتاز خوبیاں بھی ہیں، بالخصوص اس کی مشبک دیواریں، لیکن کونے کے مسدس برجوں کو جب انکے زاویوں سے ملا دیا گیا ہے تو اس سے مجموعی طور پر عمارت کی رفعت متاثر ہوتی ہے اور اسی وجہ سے یہ غیر مربوط سی نظر آتی ہے"۔ (دی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا ج چہارم ص ۲۳۲ مطبوعہ دہلی، ۱۹۵۷ء)

شاہ محمد غوثؒ کے مقبرے کے متعلق مزید معلومات حسب ذیل ماخذوں سے حاصل ہو سکتی ہیں:۔

(ا) لیپل گریفن = فیمس مونومنٹس آف سنٹرل انڈیا،

مطبوعہ ۱۸۸۶ء، ص xlvii

(ب) فرگوسن، مطبوعہ ۱۹۱۰ء، ص ۲۹۲، نگ، ۴۲۲

(ج) بر اننر ڈاسپونر = اینول رپورٹ آف دی آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا،

۲۲-۱۹۲۱ مطبوعہ ۱۹۲۴ء، ص ۳۷

(د) ڈاکٹر نورس = انڈین آرکی ٹیکچر۔

بزمِ صوفیہ

جس میں عہد تیموریہ سے پہلے کے صوفیۂ کرام، حضرت شیخ ابو الحسن علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات اور تعلیمات پیش کی گئی ہیں،

قیمت :- ے ر

تصوف و سلوک

اس میں تصوف کے متعلق ہر قسم کی عملی و علمی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو دور کر کے بتایا گیا ہے کہ حقیقی تصوف درحقیقت کمالِ اسلام اور کمالِ ایمان کے سوا اور کچھ نہیں ہے،

قیمت :- ہ

"مذکر احباب" کا تنقیدی جائزہ

از جناب ڈاکٹر ام ہانی فخر الزماں صاحبہ ریڈر شعبۂ فارسی ویمنس کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یہ دسویں صدی ہجری (۹۷۴ھ) کے فارسی شعراء کا عام تذکرہ ہے جس میں اس کے مولف بہاء الدین حسن نثاری بخارائی نے قید مکانی سے آزاد ہو کر اپنے معاصر اور قریب العہد شعراء کا مختصر حال لکھا ہے اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا ہے، چونکہ بعض شعراء خود مولف کے وطن سے متعلق تھے اور وہ ان کو ذاتی طور سے جانتا تھا، اس لیے ان کے متعلق بڑی حد تک اس کی اطلاعات معتبر ہیں، یہ تذکرہ مجالس النفائس کا تکملہ اور کسی حد تک نفائس المآثر کا ماخذ ہے، مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہ بیش قیمت علمی خزانہ ایک عرصے سے ادبی مورخوں اور فہرست نگاروں کی غلط فہمیوں اور مہمل بیانیوں کا نشانہ بنا ہوا ہے۔

اسٹوری اپنی فہرست میں رقمطراز ہیں :۔

"مذکر احباب" تاریخی نام ہے، یہ ان ۲۵۰ شعراء کا تذکرہ ہے جو بخارا اور اس کے توابع میں میر علی شیر نوائی کے بعد تھے، اور یہ ایک مقالے (الف) چنگیز خانی سلاطین یعنی شیبان خاں وغیرہ (ب) چغتائی سلاطین یعنی بابر وغیرہ اور چار ابواب (۱) وہ شعراء جن کو مولف ذاتی طور سے نہیں جانتا تھا، اور وہ فوت ہو چکے تھے، (۲) وہ شعراء جن کو مولف جانتا تھا (۳) وہ شعراء جن کو مولف جانتا تھا اور وہ اس وقت زندہ تھے، (۴) وہ شعراء جن کو مولف نہیں جانتا تھا اور وہ اس وقت زندہ تھے، اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے جو خود مولف کے اعزہ سے متعلق ہے۔" (۲-۸-۳)

ظاہر ہے کہ بابر اور اس کے بعد کے چغتائی سلاطین ۹۷۴ھ تک بخارا ہی اور اس کے توابع میں نہ گئے ہوتے، اسٹوری سے اس کی توقع نہیں کیجاسکتی ہے کہ وہ متن دیکھنے کی تکلیف گوارا کرتے، لیکن اگر وہ صرف فہرست پڑھ لیتے تو ان کو اندازہ ہو جاتا کہ بخارا کیا معنی ماوراءالنہر[1] کے باہر کے شعراء کی ایک کثیر تعداد تذکرے میں موجود ہے، اور اصفہان، اندجان، آدبہ، بدخشان، بلخ، تاشکند، تبریز، تربت، ترکستان، تون، خیوق، خبوشان، خراسان، خطا، خوارزم، روم، سیستان، شام، شیراز، شیروان، عراق، کاشان، کرمان، لار، لاہجان، مشہد، مرو، ہمنہ، تحف، نشاپور، اور ہند تک کے شعراء شامل ہیں، متن پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں تقریباً ایک چوتھائی تعداد ان شعراء کی ہے جو اس وقت ہندوستان میں تھے، ان میں بادشاہ، شہزادے، امراء، پیشہ ور اور غیر پیشہ ور سب شعراء ہیں، اور اس میں ہندوستانی شعراء کے متعلق ایسی اطلاعات بھی ملتی ہیں جو مقامی اور معاصر تذکروں میں نہیں ہیں، مولف نے خود جابجا طبقہ' ہندی میں اس کا اظہار کر دیا ہے کہ اس کا قلم بخارا اور اس کے توابع میں مقید نہیں، چنانچہ کہتا ہے:۔

۱۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشانرا ندیدہ بسن شیخوخہ رسیدہ در بخارا مدفون اند۔

۲۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر بدیشان ملاقات نکردہ وایشان بسن شیخوخہ رسیدہ در غیر بخارا مدفون اند۔

۳۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشانرا دیدہ و بسن شیخوخہ رسیدہ در بخارا مدفون اند۔

۴۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشانرا دیدہ و بسن شیخوخہ نرسیدہ در بخارا مدفون اند

۵۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشانرا دیدہ، و بسن شیخوخہ نرسیدہ در غیر بخارا مدفون اند

۶۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشانرا ملازمت کردہ بسن شیخوخہ رسیدہ

۷۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشانرا ملازمت کردہ و بسن شیخوخہ نرسیدہ در بخارا ساکن اند۔

۸۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشانرا ملازمت نمودہ و بسن شیخوخہ نرسیدہ در بخارا ساکن اند

---

[1] یعنی سمرقند، بخارا، ترمذ اور خجند

۹۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشانرا ملازمت نمودہ و بسن شیخوخہ رسیدہ ساکن بخارا اند

۱۰۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشانرا دیدہ و بسن شیخوخہ رسیدہ در بخارا ساکن نیستند۔

۱۱۔ فصل در ذکر جماعتی کہ فقیر بدیشاں ملازمت نکردہ و بسن شیخوخہ نرسیدہ اند و ساکن بخارا نیستند

زمانۂ تالیف

رضا زادہ شفق امینی تاریخ ادبیات ایران[1] میں تحریر کرتے ہیں:۔

"مذکر الاحباب[2]" ترجمۂ شعرای زمان میر علی شیر نوائی تا سال ۹۷۴ھ تالیف نثاری بخارائی۔

سید مبارز الدین رفعت مترجم تاریخ مذکور[3] لکھتے ہیں:۔

"مذکر الاحباب[4]" از نثاری بخارائی، میر علی شیر نوائی کے زمانے کے شاعروں کا تذکرہ ۹۷۴ھ تک۔"

معلوم نہیں ان دونوں اصحاب کو اس کے سنہ کا کیسے اندازہ ہو گیا، کیونکہ انھوں نے اس تذکرے کے جو نئے نام لکھے ہیں، ان میں پہلے میں ۱۳ سال زیادہ اور دوسرے میں ۳۲ سال زیادہ شمار ہوتے ہیں، دوسری بات قابل توجہ یہ ہے کہ میر علی شیر نوائی کی وفات ۹۰۶ھ[5] میں ہو چکی تھی، ان کا زمانہ ۹۷۴ھ تک کیونکر باقی رہ گیا، اسٹوری اتنا تو سمجھے کہ یہ تاریخی نام ہے، مگر اس پر غور نہیں کیا کہ یہ تذکرہ کے آغاز کی تاریخ ہے یا اختتام کی؟ حالانکہ مولف نے مقالے میں واضح کر دیا ہے:۔

چوں دریں تذکرہ زبانِ قلم ذکر احباب کرد از ہر باب
نام و تاریخ سالِ اتمامش گشت از انزو "مذکر احباب"

لیکن متن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سنہ یعنی ۹۷۴ھ کے بہت بعد تک اضافے کا کام جاری رہا، چنانچہ خواجہ حسین مروی کے بیان میں مولف نے اس کے حج کو جانے اور وہاں سے

---

[1] ص ۸۱۸ [2] ص ۱۰۰۵ [3] ص ۵۲۹ [4] ص ۱۰۰۶، [5] مجالس النفائس تالیف میر علی شیر نوائی بسعی و اہتمام علی اصغر حکمت، مقدمہ ص ج

واپسی کا بھی ذکر کیا ہے:-

"بعد از وفات بادشاہ بطواف کعبہ معظمہ و مدینہ مکرمہ مشرف گشتہ بہند معاودت نمود۔"

دو اور معاصر اور مقامی تذکرہ نویس:-

(۱) علاء الدولہ قزوینی نفائس المآثر میں لکھتے ہیں:-

"خواجہ حسین مروی در تاریخ ۹۸۰ھ بعد از مراجعت سفر مبارک از حرمین شریفین۔"[1]

(۲) ملا عبد القادر بدایونی منتخب التواریخ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"او در سنہ ہشتصد و ہفتاد و نہ از ہندوستان رخصت وطن حاصل کرد و شیخ فیضی

کہ تربیت یافتۂ وے بود "دام ظلہ" تاریخ یافت۔"[2]

تذکرۂ احباب کا یہ بیان کہ "بعد از وفات بادشاہ" یعنی ہمایوں، قابل بحث ہے، کیونکہ ہمایوں

کی وفات ۹۶۳ھ میں ہو چکی تھی، یہ اور بات ہے کہ اس کے پاس تازہ اطلاعات حاصل کرنے کے

ذرائع نہیں تھے، مگر حج کو جانا اور وہاں سے واپسی کا واقعہ اٹل ہے۔

اس سے پہلے حج کو جانے کی اطلاع کہیں سے فراہم نہیں ہوتی[3]

چونکہ مؤلف تذکرۂ احباب نے تاریخیں لکھنے سے گریز کیا ہے اس لیے اس سے زیادہ اندازہ

ہو سکا اور سنہ آغاز کا کہیں سے پتا نہیں چلتا۔

سبب تالیف مؤلف نے تذکرے کے مقالے میں تحریر کیا ہے کہ مجالس النفائس تالیف میر علی شیر

نوائی کے سلسلے کو قائم رکھنے کے لیے اس نے دوستوں کے اصرار پر تذکرہ کی تالیف کا کام شروع کیا

ہے، اور ترکی زبان کا نسخہ اس کے مطالعے میں رہا۔[4]

---

[1] نفائس المآثر ق ۳۵ ص، [2] ۳، [3] یہ استنباط مصنف کا ہے "دام ظلہ" کے اعداد ۹۸۰ھ ہوتے ہیں، اگر ۹۷۹ھ ہوتا تو مد ظلہ تاریخ ہوتی [4] عبد اللہ خاں کی فتح ماوراء النہر کے سلسلے میں ایک نسخے میں کاتب کی غلطی سے ۹۸۰ھ مدۃ تاریخ لکھ دیا گیا ہے جو دوسرے نسخے میں ۹۹۱ھ ہے، لطائف نامے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

انتساب اس کتاب کو اس نے دو آدمیوں کے نام سے معنون کیا ہے،

(۱) ابو الغازی اسکندر خاں بہادر

محمد خو و یوسف رو و سلیماں جاہ و یحییٰ دل / سکندر نام و خضر الہام و موسیٰ دست و عیسیٰ دل

(۲) عبد اللہ خاں بہادر

آں عالی حضرت سلیمان حشمت بنظر اکسیر اثر منظور گردانیدہ بسمع قبول اصغا نماید

ہر آئینہ از توجہ انور ضمیر نکتہ پرورش سخن از آب زلال صافی تر گشتہ بر وجہ حسن بکمال خواہد رسید

ایں نسخۂ دلکشا کہ بنمودہ جمال / پاکیزہ تر است نقش از آب زلال

خواہم کہ ز لطف خسرو دہر رسد / بر وجہ حسن معانی او بکمال

و باللہ العصمۃ والتوفیق۔"

ترتیب مضامین ۱- مقالہ

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، حمد معبودی را کہ مجموعۂ وجود انسانی را کہ نسخۂ جامعہ

جزو کل است" سے شروع ہو کر نعت، انتساب بابو الغازی، تعریف نظم و تعریف نثر

سبب تالیف انتساب بتمام عبد اللہ خاں اور تاریخ کے بعد

ہر چند کہ ایں نسخہ بوجہ حسن است / بس نیست ہمیں عیب کہ تالیف من است

اللّٰھم استر عیوبنا واغفر ذنوبنا واختم بالسعادۃ آجالنا" پر ختم ہوتا ہے،

۲- ابواب و فصول:-

۱- باب اول در بیان احوال سلاطین چنگیز خانی بر دو فصل مشتمل است

۲- باب دوم در بیان احوال سلاطین جغتائیہ بر دو فصل مشتمل است

۳- باب اول در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشان را ملازمت نمودہ بر چہار فصل مشتمل است

۴۔ باب دوم در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشان را ملازمت کردہ بر چہار فصل مشتمل است

۵۔ باب سوم در ذکر جماعتی کہ فقیر ایشان را ملازمت نمودہ بر چہار فصل مشتمل است۔

خاتمۂ کتاب۔ در ذکر اجداد و اعمام و برادران و اقربای فقیر۔

ترقیمۂ کاتب۔ اللّٰھم اغفر لمولفہ و کاتبہ و قارئہ و من نظر الیہ بحرمۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم بالخیر بالبلدۃ المحفوظ سمرقند، بہجرۃ النبویہ، ہنصد و ہشتاد، کتبہ فقیر میرک

دستم بزیر خاک چو خواہد شدن تباہ   باری بیادگار بماند خط سیاہ

پر ختم ہوتا ہے۔

تذکرۂ احباب مجالس النفائس کی تنقید اور تکملہ کی حیثیت سے مؤلف تذکرۂ احباب نے شعرا کے ترجمہ کے دوران میں جا بجا میر علی شیر نوائی کے بیان کی تکمیل اور تنقید بھی کی ہے۔ خواجہ ایوب ابو البرکہ کے بیان میں میر علی شیر تحریر کرتے ہیں کہ

"شرح حالات او کردن غایت بے حجابیست"[۱]

صاحب تذکرہ اس کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"خواجہ ایوب ابو البرکہ از اکابر ماوراء النہر است۔ در زمان شباب بہری رفتہ بعید از معاش کردہ بنابران در تذکرہ امیر کبیر او را بد یاد کردہ اند، از و چیزی نوشتہ، بسیار خوش طبع بودہ، و سخنان خوب از و منقول است و غزلہای زیبا و قصائد غرای او مشہور است و این غزل از سخنان دلکش او ست:۔

ای شاخ گل چو سرو سہی قد کشیدہ ای   بر برگ گل خطی ز زمرد کشیدہ ای

قدت بر آمدہ چو الف مد ظلم   از ابروان فراز الف مد کشیدہ ای

تصویر نیکشی بالکش ای نقش بند چین   ناید چو چشم و زلف اگر صد کشیدہ ای

[۱] مجالس ص ۱۱۶-۱۱۵

جز نامۂ قبول من ای خامہ قدر   ہر نقش دلپذیر کہ باید کشیدہ ای

از دولت وصال فراقی طمع مبر   جور و جفای یار چو بیحد کشیدہ ای

خواجہ ایوب از کوزہ ہمان برون تراود کہ در وی ست۔ از اطوار و الد شریف خود بی بہرہ نبود و بہزل و مزاح مزاجش مائل بودہ و حلویتش بنوعی بودہ کہ ہر چند کس مقبوض او را میدیدہ منبسط می گشتہ و بعقیدی خواجہ بمرتبہ ای بودہ کہ جناب سید محمود خواجہ فرمودند کہ بادشاہ او را برسم رسالت بگجرات فرستادہ، بصحبت تمکیں گجراتیان تعلق دل خواجہ در آتش انگندہ اند، بجوانان مائل گشتہ ہمانجا ماندہ بادشاہ بعد از فتح او را در قفس محبوس میداشتہ اند و او بی صبری کردہ مترنم این مقالہ بودہ

آصفی صبر ندارد بغم و درد فراق   میکشد محنت ایوب ولی صابر نیست

بعد از ان بمضمون آنکہ، در عفو لذتی ست کہ در انتقام نیست

عمل نمودہ جریمہ اش را عفو فرمودہ رعایت کردہ اند، بعضی بر آنند کہ او را گجراتیان محبوس کردہ اند، این غزلش نیکو واقع شدہ

سحر گہ صحنِ چمن پر گل و شقائق بود   چمن بکام دل عندلیب عاشق بود

ز راہ مقصد اگر تافتم عنان طلب   ز ہمرہی رفیقان نا موافق بود

ز خط و خال تو آموختم دقائق عشق   زہی مجاز کہ مجموعۂ حقائق بود

چہ ریخت خون من از درد دل خلاص شدم   مرض علاج پذیر و طبیب حاذق بود

نداشت طاقت جور و جفای او ایوب   اگرچہ بر ہمہ اقران بصبر فائق بود

۲۔ حیدر کلیچ کا ترجمہ جو مجالس النفائس میں دیا گیا ہے، اس میں یہ اضافہ ہے:[۱]

"این غزلش بسیار خوش و دلکش واقع شدہ و شہرت تمام دارد،

[۱] مجالس النفائس ص ۱۹۵ (از حیدر کلیچ)

دلا! مجنوں صفت خود را خلاص از قید عالم کن	رہ صحرای محنت گیر و در وادیٔ غم کن
ہر کس دوستی کردی شد آخر دشمن جانت	اگر با خود نہ آئی دشمن محروم دوستی کم کن
بدرد و داغ نومیدی دوا از کس مجوای دل	بہ اظہار جراحتہای خود نہ یاد مرہم کن
چو در خیل سگان یار جایابی غنیمت دان	نمی گویم کنار از صحبتِ یاران ہمدم کن
سنال از سستی عہد بتان سنگدل حیدر	اساس عقل برہم زن بنائی عشق محکم کن

۳۔ خواجہ عبداللہ حصہ کے بعد کے بیان میں کہتے ہیں:۔

ولد ارشد خواجہ ابوالفضل است کہ شمہ مناقبش امیر نظام الدین علی شیر در تذکرۂ[1] بیان فرمودہ فضائل بسیار داشت، بواسطۂ ضعف بصر فضائلش در نظر اولی الابصار پوشیدہ ماند و ایں ابیات بدو منسوب است،

ہیچ شب نیست کہ از ہجر توام ماتم نیست	روز من ماتم زدہ از شب کم نیست
محرمی نیست کہ گوید سخن من با او	آنکہ گوید سخن من بر او محرم نیست

در کبر سن فوت شد

۴۔ مولانا نضائی کے بیان میں کہتے ہیں:۔

ولد مولانا بقائی ست در تذکرہ[2] امیر علی شیر ملا را بکمانگری نسبت کردہ اند فقیر پرسید کہ ملا زاں بچہ سبب بایں صنعت منسوب اند، گفت دریں نسبت مرا صنعی نیست ایں معنی را بر من شکستہ بستہ اند، بتقریب آنکہ بمظفر برلاس بہری رفتہ بودم و در دکان کمانگری در حلقہ استادان گوشہ ای گرفتم امیر سہم سعادت کیمیا اثر را بجانب فقیر انداختہ نشانۂ تیر ملامت ساختہ۔

---

[1] تذکرہ زیر نظر میں نضائی نام کا کوئی شاعر مذکور نہیں، البتہ بقائی (حاشیہ نقابی) کے ترجمے میں علی شیر نوائی نے کمانگری کی طرف صرف اشارہ کیا ہے، ص ۵۸

در بلخ ۔ تی در منزل فقیر می بود، ہمانجا فوت شد۔

تذکرِ احباب نفائس المآثر کے ماخذ کی حیثیت سے

تذکرِ احباب کی طرح نفائس المآثر[1] بھی تاریخی نام ہے، فرق اتنا ہے کہ تذکرِ احباب سے خود مؤلف کے بیان کے مطابق اتمام کی تاریخ نکلتی ہے اور نفائس المآثر سے اس کے مؤلف کے بیان کے مطابق آغاز کی، دونوں تاریخوں کا تقریباً ایک ہی زمانہ ہے۔ نفائس کا اصل کام ۹۸۲ھ میں ختم ہوا تھا۔ اور اضافے کا سلسلہ خود اس کی داخلی شہادتوں کی بنا پر ۹۹۸ھ تک جاری رہا، مؤلف نفائس المآثر نے صریح الفاظ میں تو اس ماخذ کا اظہار نہیں کیا لیکن دو جگہ اس کا حوالہ دیا ہے

۱۔ مقصود تیرگر کے ترجمے میں

"بہاء الدین حسن صاحب تذکرۂ شعرا گوید۔"

۲۔ خودنثاری بخاری کے ترجمے میں

"اسمش بہاء الدین حسن است در تذکرۂ شعرای خود میگوید۔"[2]

لیکن حقیقت یہ ہے نفائس المآثر کا معتدبہ حصہ تذکرِ احباب کا ممنون ہے، مگر یہ امر بھی واضح کردینا ضروری ہے کہ صاحب نفائس نے تذکرہ کی نہ اندھی تقلید کی ہے، اور نہ تنہا اسکی اطلاعات پر قناعت کی ہے بلکہ اس کے ساتھ اپنی تحقیقات بھی تحریر کی ہیں، جابجا تذکرہ کے انتخاب اشعار سے صرف نظر کرکے اپنا انتخاب دیا ہے،

۱۔ وہ شعرا جن کو نفائس نے تذکرہ سے محض نقل کر دیا ہے اور ان کے متعلق معلومات میں کوئی نیا اضافہ نہیں کیا ہے۔

(۱) عبدالعزیز خاں[3]، (۲) ابوالفتح سلطان سعید خاں بن ابوسعید خاں۔[4] (۳) شادی خواجہ بیاری کا

---

[1] نفائس المآثر نام منہوکہ اسمی ست با مسمی موافق و سال شروع را مطابق "مقدمۂ نفائس" ورق ۹ (ب)
[2] ورق ۲۰۴ (ب) [3] تخلص عزیزی۔ ہر کہ عزیزی بدید خط لب یار گفت | روز سیاہ است این یا شب ہجران حسین
کی کہیں تذکرہ [illegible]

(۴) میرابراہیم جانی[1] (۵) مولانا قوسی[2] (۶) مولانا فروغی (۷) یزدی (۸) طاہر قاضی (۹) علی بیگ (۱۰) ہمدم کوکہ (۱۱) محرم کوکہ۔ (۱۲) مولانا نگی۔

وہ شعرا جن کے متعلق نفائس کو مذکرے سے نئے معلومات حاصل ہوئے ہیں،

۱۔ کامران۔ (ایک شعر) چوں بمقصود نشد ہیچکسی رہ برما — بعدازیں خاک درود؟ بر سر مغان وسر ما

۲۔ عسکری۔ (۰۰) گفتی بجشش ماہ تمام است مہ نو — در حضرت او عرض مکن دعوی کم را

۳۔ ابراہیم مرزا ابن سلیمان بادشاہ[3] ہنگام قتل ایں رباعی خوانده

ای لعل بدخشاں ز بدخشاں رفتی — تابنده چو خورشید درخشاں رفتی

در دہر چو خاتم بسلیماں بودی — افسوس که از دست سلیماں رفتی

سنبل زلفش دلم را دام نتوانست کرد — شاخ نازک بود مرغ آرام نتوانست کرد

(رباعی) آئینہ در رخسار تو خورشید نماست — خط رخت از سبزہ تر روح فزاست

ہر کس که برخ دید خط سبز تو گفت — سالی که نکوست از بہارش پیداست

۴۔ قاسم (پسر کامران) (۲ شعر)

ندارد کس ز خوباں ساعدی کاں نازنین دارد — ز خوبی آنچه باید ماہ من در آستین دارد

اندک استغنای او عشاق را دل خوں کند — گر بقدر حسن استغنا کند کس چوں کند

۵۔ ہمایوں عراقی (۲ شعر)

شب مرا ہجراں ز پرتوی جمال تو باشد — خوش آں فراق که پایان آں وصال تو باشد

بہر دو مردون دلب ناکشودم باز ازاں ست — که نالہ ای کنم آں موجب ملال تو باشد

---

[1] مرزا ابراہیم جانی نفائس۔ میرابراہیم اندجانی مذکر نسخہ (ب) (باضافہ استاد ترکی) [2] قدسی، نفائس [3] وفائی۔ نفائس

۶۔ مولانا وصفی۔ مولانا کاتبی را میگویند که چهار معنی خاص در سلک نظم آورده بود و ایں بیت

ازاں جملہ است۔ جانا صدای تیغ تو از چہار باند — آواز آب ز حمت بیمار می برد

ملا در تتبع ایں پنج بیت گفته و با لماس سخن در ہای خاص سفته، بیت:۔

گرفته تیغ تو بر حلق راہ رفتن جان — ز آب تیز گذشتن نمی توان آساں

چوں بسر رست تیغ تو نتواں کشید آہ — باید بزیر آب نفس داشتن نگاہ

مضطرب گردم چو گیرد در گلویم تیغ یار — در گلوی ہر که گیرد آب گردد بیقرار

گفتی ز تیغ من شود آخر جہاں خراب — آری جہاں خراب شود عاقبت ز آب

از تن خاکی بر آرد گرد ہر دم آہ سرد — تیغ بردار و بآب لطف خود کن دفع گرد

و آنرا خمسہ متحیرہ نام کردہ

۷۔ جمالی ہندی،[1] (ایک شعر) ننگ تک بند قلندر کشتی تجرید را — از پی تسکین بحر بنبوائی لنگر است

۸۔ مولانا فردی۔ تاریخ وفات جناب قاضی اختیار را نیکو گفته

ای میر که زیب داشت ناموس از تو — رفتی و جہاں شده مایوس از تو

تاریخ وفات تو چه گوید فردی — ای عمدهٔ اہل علم افسوس از تو
۹۲۱ھ

۹۔ مولانا افسری۔ در خدمت عبید اللہ میبوده، خود را در سلک مقرباں مینمود، اشعار بسیار دارد، خود را ثانی نوائی خیال کرده و ثانی تخلص میکرده۔

ز کعبه تا سر کویت ہزار فرسنگ است

۱۰۔ درویش مقصود تیرگر

خوباں ہری خوبتر از آب حیاتند — بسیار ربایندہ و شیریں حرکاتند

در مسجد جامع بیگم بود ساکن بود ہمانجا مدفون شد۔

---

[1] جمال، مذکر،

۱۱- میر ہمایون۔ (۳ شعر)

نام زنجیر جنون گم شدہ بود از عالم — در رہ عشق من این سلسلہ برپا کردم

صاف از نقش جہان تا شود آئینۂ دل — طلب از میکدہ ہا جام مصفا کردم

بکویش رفتم و گفتم کہ بینم روی نیکو یش — بغیر ش ہمنشیں دیدم گذشتم از سر کویش

۱۲- نویدی نیشاپوری۔ بمیر قریش نیشاپور قرابت داشت، بہند رفتہ اعتباری پیدا کردہ

وقتیکہ محمد رحیم سلطان دندان خود کندہ بتقریب آں از دار فنا رحلت نمودہ تاریخ او را

"کند دندان و رفت از دنیی" گفتہ بود

۹۷۱ھ

۱۳- مولانا شیدا۔ از شاعران قدیم است، خدمت بابر بادشاہ میبود۔ تاریخ گفتہ بود

در ارک قلعۂ بلخ عالی عمارتی — تا آب و خاک باشد بادا بقای منزل

تاریخ و نام بانی از من طلب چو کردند — گفتم باہل دانش "تسکین ترای عادل"

۸۹۶

۱۴- عبدی۔ خانہ ای ساختہ بود و تاریخ و نام او گفتہ :-

حاجبش این خانہ را تاریخ و نام — "بیت الاحزان، فقیران" کردہ است

۱۵۱ — ۹۵۸ھ

۱۵- جانی شمس بانی طوطی طبعش در ہند بقفس خاک منزل نمود۔

۱۶- مولانا شعوری۔ برسم سپر بہرد متوجہ بود، گفتم مرو، قبول ننمود از آنجا مریض مراجعت

کرد، و شیر شتر مرغ وحش بدام صیاد اجل گرفتار گردید، این شعر حسب حال اوست:

در زیر زمین ست ترا جای شعوری — گر زیر نگیں ساختہ ای روی زمیں را

۱۷- حاضری۔ ولد رشید مولانا غانجی است۔ بصلاح مشہور است، واقعات عجیب و غریب

نقل میکند۔ روزی گفت کہ در مجلس شمس الدین شانہ رفیع شانہ حضرت خضر علیہ السلام در بیداری

لے مقام وفات مذکور نہیں۔ نفائس کے "مرو" نفائس

سخنش را شنیدم، چہ ممکن بود تکذیب او کردہ نشد و بجز وی اعتقادی نیست، مدتی در خدمت ابراہیم مرزا بود و رعایت بسیار یافتہ، و در تشخیص سخن دقت بسیار میکند لیکہ از مرتبۂ اعتدال دیدم،

میگذرد و این غزل از سخنان اوست

ہر نگاہ تو از دل کشیم آہ دگر — بود کہ آہ شود باعث نگاہ دگر

وطن بدیدۂ من کن کہ نیست یوسف را — بغیر دیدۂ یعقوب جلوہ گاہ دگر

بود لبوز دلم برق آہ شاہد حال — چہ حاجت از پی اثبات این گواہ دگر

کجا بدامن آں شہسوار حسن رسد — کہ ہست بر سر ہر راہ دادخواہ دگر

چہ حاضری منم آں شہسوار کشور عشق — کہ دارم از غم عشق ہر طرف سپاہ دگر

و این مطلع نیز از سخنان رنگین اوست :-

دریدہ جیب قبا گل ز رشک پیراہنش — بنفشہ بستۂ بند قبای یاسمنش

۱۸- نجاتی۔ تا نوید وقف بر آیات روی مصحفش — در ودات غنچہ داد و سرخی بسیار گل

۱۹- مولانا سہروری۔ تا دست گلرخی من حیران گرفتہ ام — گلدستۂ زگلشن دوران گرفتہ ام

۲۰- خواجہ حسین مروی ولد خواجہ میر دوست دیوان۔[لے] مدتی در فاخرۂ بخارا بتحصیل علوم

پرداخت۔ این غزل از اشعار رنگین اوست :-

تا ہلال عید اہل دید شد ابروی تو — مردمان دیدند ماہ عید را بر روی تو

روی خود وقت سلام ای آفتاب از ماہتاب — در نماز عید اگر افتیم در پہلوی تو

بایدش تعویذ بند از رشتۂ جاں ساختن — ہیچ تعویذ انکہ دل بست است بر بازوی تو

لے خلف صدق خواجہ جلال الدین منصور سمنانی است" نفائس، اور آگے چل کر مذکور ہے :-

شد از التفات شہنشاہ عادل — حسین بن منصور صدر افاضل

گرچہ می بیند ہر سو تیز بینیان ماہ عید
تو چنان ماہی کہ نتوان تیز دیدن سوی تو

سرفرازم کرد از طوق غلامی تا نہاد
منتی بر گردنِ من حلقۂ گیسوی تو

اکبر شاہان جلال الدین محمد آنکہ ہست
نہ سپہر نیلگون یک خیمہ از اردوی تو

تا بود روی زمین آرام گاہ نیک و بد
دور بادا چشم بد از عارضِ نیکوی تو

۲۱- ملا سہمی۔ از شعرای نو رسیدہ بود بہند رفتہ، بملازمت بیرم خان مشرف گشتہ و خان این مطلع را گفتہ

دُرد نوشان خرابات عجب مستانند
کہ بیک جرعہ می ہر دو جہان بستانند

مولانا ادہم حسین گفتہ :۔

کشور ہند بہر گوشہ سیہ چشمانند
کہ ہمہ آفت دینند و بلای جانند

ادہم ارسلان در تتبع گفتہ :۔

ماہرویان جہان وصفِ ترا نتوانند
کہ برخسار تو آئینہ صفت حیرانند

سہمی را ہم سعادت بطالع افتادہ و این مطلع از مطلع ضمیرش طلوع نمودہ :۔

آن کسانیکہ سفیدی ز سیاہی دانند
خط و رخسار ترا آیتِ خوبی دانند

۲۲- مولانا قدسی :

از دو چشم تو نیاید رسم مردی ہرگز
کافران کجا دانند شیوۂ مسلمانی

چو تو یوسف مصری در لطافت خوبی
بر درت عزیزان را آرزوی دربانی

بسکہ کوکب سعدی در سپہر نیلوئی
می سزد ترا گویند مہر و ماہ تابانی

نیکنی شکر ریزی از شکر لبان قدسی
طوطی شکر سائی در فنِ سخندانی

۲۳- مولانا عہدی :۔

از دیدن تو قطعا نتوان طمع بریدن
چشم منی و باشد چشمے برای دیدن

ثمن دقا متقش را ای فاختہ بیاد آر
آموز در ہوایش از چشم من پریدن

از جان گذشت تیرش بر دل رسید گفتم
تا کی شکستگان را خواہی بجان رسیدن

صد بار اگر بہ پیچی بر خود چو غنچہ نتوان
از باغ ہجر یک گل بکام ہجر چیدن

منعم مکن چو عہدی از کوی عشق بازی
گر سر رود نخواہم زین کوی پا کشیدن

۲۴- شیخ ابو الوجد :

گرفت برقع خط ماہروی جانانرا
حجاب کفر بپوشید نور ایمان را

ہنوز بر سر آن کوی ناگرفتہ وطن
دل از غریب نوازی گرفت جانان را

دراز عمر ترا ز من کسی نخواہد بود
اگر ز عمر شمارند روز ہجران را

بغیر صورت خوب تو کی رسد بخیال
اگر خیال تو ان کرد معنی جان را

حدیث لعل لبش فارغی مگو با غیر
کہ میبرد خس و خار آب حیوان را

این مطلعش بسیار خوب واقع شد

جان من از دیدہ و در دل میکنم منزل ترا
تا نہان از مردمان بینم بکام دل ترا

۲۵- سلطان عادل لاری :

دوش کہ آن بیوفا جور و جفای نداشت
نالۂ دل افسردہ بود گریہ صفای نداشت

دوش کہ پیکان یار در دل تنگم نبود
چون جرس بینوا ہیچ صدای نداشت

دوش کہ آمد طبیب بر سر بیمار غم
چون مرض عشق بود ہیچ دوای نداشت

۲۶- کوکبی : چون کوکبی حیران شادم بدل خوبان
عشقت مرا پیشہ ہر کس کہ ہنر دارد

۲۷- امیدی عراقی : قصیدہ در تتبع انوری گفتہ :

سفیدہ دم کہ ازین عنکبوت زرین تار
گسست رابطۂ تار و پود لیل و نہار

دری مقتول شدہ۔

۲۸۔ مولانا ہجری: غریب تو کس نیست اینچنین کہ منم غریب ترکہ بخاطر نمیرسد وطنم

در تبریز فوت شدہ۔

۲۹۔ خواجہ زادہ کابلی :

مرادپرسی کہ از خوباں ترا خیل سپہ چند است عجب شاہی کہ از دیوانہ می پرسی کہ بر خیز است

۳۰۔ غزالی مشہدی :

درد آہ از دل من کیں ہمہ پرکالہ دردست گردبادی ست کہ صد برگ گل و لالہ درد ست

نفائس المآثر نے تذکرہ احباب پر جو اضافے کیے ہیں ان کے لیے ایک علیحدہ رسالے کی ضرورت ہے، کیونکہ تذکرہ احباب کے جو شاعر خاص بخارا سے تعلق رکھتے ہیں ان کی تعداد میں بھی نفائس نے اضافہ کیا ہے اور تذکرے ان کے حالات، اشعار، واقعات تاریخی اور تاریخ وفات میں بھی بیشمار اضافے کیے ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، اس لیے کہ ہمارا مقصد صرف تذکرہ احباب پر تبصرہ ہے، نفائس المآثر پر گفتگو مقصود نہیں، مگر اس کا اظہار کر دینا ضروری ہے کہ تذکرہ اور نفائس ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں، اور تذکرہ نفائس اور مجالس کی درمیانی کڑی ہے۔

تذکرہ احباب کے دو نسخے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی آزاد لائبریری کے حبیب گنج[1] سکشن میں اس تذکرے کے دو نسخے ہیں:۔

اول $\frac{15}{1}$ ق سیاہ جلد کا ہے جس کی پشت پر سنہرے الفاظ میں "تذکرہ احباب" تحریر ہے، اور اسکے نیچے اوپر باریک باریک سنہری دھاریاں زیب و زینت کے لیے بنی ہیں، شروع صفحے پر "بہاء الدین حسن نام مؤلف"، اس سے تھوڑے فاصلہ پر کونے میں ہدیۂ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب تھہری، ۲ر شعبان المعظم سنہ ۱۳۲۰ جزاہ اللہ خیرا قلمی ۹۰۸ھ" لکھا ہوا ہے، پھر درمیان میں کاغذ کی چٹ لگا کر حسب ذیل تحریر درج ہے:۔

[1] کتابخانہ حبیب گنج پر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب صدر شعبۂ فارسی کا ایک مضمون "فکر و نظر" جنوری ۱۹۶۱ء میں نکل چکا ہے۔

"اسمائے خوشنویساں کہ احوالش در تذکرہ احباب مذکور است (۱) میر شیخ پوران ولد شیخ نور اللہ حسن (۲) حافظ سلطان علی اوبہی (۳) مولانا کمال الدین ابو الخیر (۴) مولانا فخری ولد حافظ شیرازی (۵) خواجہ جبین ولد میر دوست (۶) مولانا میر علی الکاتب (۷) مولانا عہدی"

اس نسخہ کی تقطیع ۸ء۸ × ۶ اور ضخامت ۱۳ سوت ہے،

صفحات کی تعداد ۱۱۰ اوراق اور ہر صفحے میں ۱۵ سطور ہیں، خوشخط اور نستعلیق لکھا ہوا ہے، آیات قرآنیہ اور اسماء رجال (عنوانات میں) سنہرے حرفوں میں لکھے ہوئے تھے جن میں سے کچھ بدقت تمام اور باقی بالکل نہیں پڑھے جا سکتے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ عرصے سے بہت خستہ اور شکستہ حالت میں تھا، جابجا کیڑوں نے بھی کھا لیا ہے، اب ہر ورق پر باریک کاغذ چڑھا دیا گیا ہے، کاتب خوشخط ضرور ہے مگر کسی قدر بد املا اور بہت بے پروا ہے، فصول کی ترتیب میں اس نے بے توجہی سے کام لیا ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی کے مطالعے میں رہ چکا ہے، کیونکہ متن کی سرخیاں مثلاً ہراۃ، بخارا، وجہ تسمیہ بخارا، سمرقند اور توران جو مؤلف نے ترجمۂ شعراء کے سلسلے میں کہیں کہیں ضمناً دیے ہیں، سب حاشیے پر نوٹ ہیں ایک جگہ مؤلف نے "از لفۂ الجنۃ للمتقین" تحریر کیا ہے، قاری صاحب نے از لفت کو بھی شہروں کے ساتھ حاشیے پر نوٹ کر دیا،

جابجا کتب خانہ حبیب گنج کی نیم دائرہ مہریں پڑی ہیں، دائرے کے اوپر "ذخیر جلیس فی الزمان کتاب" اور اندر کی طرف اوپر سنہ ھ پھر "کتب خانہ حبیب گنج" اور اس کے نیچے "ضلع علی گڈھ لکھا ہوا ہے"، ایک آدھ جگہ مہر کا سنہ ناخواندہ ہے۔ باقی کسی میں ۱۳۱۴ھ، ۱۳۱۷ھ اور ۱۳۲۴ھ پڑھا جاتا ہے، آخری صفحے پر نوٹ ہے:

"نسخۂ ہذا شش سال بعد تالیف نوشتہ شد، تاریخ تالیف تذکرہ احباب ۹۷۴ھ۔

حبیب الرحمٰن ۱۶ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ۔

نمبر ۱۵/۲۔ دوسرا نسخہ بیرونی شکل میں کم و بیش ایسا ہی ہے لیکن اندر سے بہت خوشخط ہے،

اور تراجم کے درمیان میں فصول کے عنوانات سرخ روشنائی اور جلی قلم سے لکھے ہوئے ہیں، فہرست سلاطین چغتائیہ کے تراجم اور کاتب کا ترقیمہ اس سے خارج ہے، تراجم کے لحاظ سے یہ نسخہ پہلے نسخہ سے کم نہیں ہے اور اس وقت یہ نسخہ بہت کار آمد ثابت ہوتا ہے، جب کہ پہلے نسخے کے عنوانات صاف نہیں پڑھے جاتے، اس میں ۱۱۳ صفحات اور ہر صفحے میں ۱۳ سطور ہیں، اس کی غلط شیرازہ بندی اس کا سب سے بڑا عیب ہے،

حال مؤلف | اسٹوری کو یہ شکایت ہے کہ مؤلف نے اپنا نام مقالے میں نہیں دیا ہے، اس وجہ سے "برٹش کوارٹرلی" میں اس تذکرے کے مولف کا نام نہیں ہے۔ مقالے میں تو واقعی نام نہیں ہے لیکن اس سے ذرا آگے بڑھ کر روزبہان الاصفہانی کے ترجمے میں وہ لکھتا ہے کہ "ایشان فقیر را بہا الدین حسن نام کردند وایں قطعہ را گفتہ بید خود نوشتہ وآں خط مدتی در دست فقیر بود، قطعہ :

خواجہ حسن نقد دل باد شاد   خواجہ بہاء دین کنمش نام
ثانی آں خواجۂ ابرار باد   ابنتہ اللہ نباتاً حسن

تخلص نثاری تھا، سلطان عادل لاری کے ترجمے میں لکھتا ہے،

لمؤلفہ، دفاتا ز میان کم شد نثاری را

خاتمے میں اس نے اپنے چند اجداد اور اعمام کے نام ضرور گنائے ہیں، مگر تالیف میں کہیں بھی اس کی زندگی کے حالات، ملازمت و معاش وغیرہ کا پتا نہیں چلتا، ترجموں کے دوران کہیں اپنے اشعار بھی دیے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایران و ہندوستان کے شاہان وقت سے اس کو تعلق تھا اور فارسی کے علاوہ کبھی کبھی ترکی میں بھی شعر کہتا تھا، یہاں کچھ اشعار نمونے کے طور پر نذر ناظرین کیے جاتے ہیں،

درچمن سرو خراماں مرا یاد کنید   در سخن غنچۂ خنداں مرا یاد کنید
جعد سنبل چو برخسار گل افتد بہ ہو   حلقۂ زلف پریشان مرا یاد کنید

درشب تیرہ چو برقع فگنند بدر منیر   پرتو شمع شبستان مرا یاد کنید
در مصاحف چو در آید بنظر آیۂ وقف   لب لعل و خط ریحان مرا یاد کنید
ابر نیسان بہاراں چو گہر افشاند   کلک نظم گہر افشان مرا یاد کنید

مطلع خواجہ نظام الدین یحیٰی الہاشمی

غریب عشق ماند بر زمین گرنا گہاں پہلو   کہ گرداند ز خاک او را کہ گرداند بداں پہلو

مطلع مؤلف

چناں بر خاک حسرت ماند جسم ناتواں پہلو   کہ نتواند دگر گشتن ازیں پہلو بآں پہلو

در تعریف عبید اللہ خاں :

تیر تو کہ چوں عقاب پرواز گر است   از چشمۂ چشم دشمناں آبخور است
مانند کلید باب فتح آمدہ است   تیغ تو کہ آئینۂ روی ظفر است

در تعریف عبد العزیز خاں

چناں طی کردہ در ملک سخاوت راہ احساں را   کہ صد چو حاتم طی بر درش بہر سوال آمد

در تعریف خواجہ عبد السلام

ای کمال دولتت از وصمت نقصاں بری   وی ضمیر روشنت آئینۂ اسکندری

در تعریف افتخار الاطباء مولانا محمد مزید :

بسی تا در فناں بردند قانون شفا از تو   کہ اندر چنگ ایشاں بود عاجز بو علی سینا
کلام معجزت باشد مدام از شرح مستغنی   ازاں نفس نفیست بزند بر خلق استغنا

حافظ ابراہیم، گاہی این کمینہ را بالطاف خاص مخصوص میساخت، تبقریبی ایں رباعی نقیر داعی را یاد فرمودہ بود،

ای مظہر لطف ذو المنن خواجہ حسن   ظاہر شدہ ایم گرچہ مادر دو بدن

ہر دو بہم یکیم در عالم انس — کہ در غلط افتم کہ توئی یا من

واین فقیر در تتبع گفتہ

مشکین رقمت کہ نامزد گشت بمن — چوں بوی اویس آمدہ از سوی قرن

ہستی ملک الکلام و در ملکِ سخن — تو خسرو و بندۂ تو صد خواجہ حسن

فقیر بجہت تحفۂ بادشاہ جمجاہ ہمایوں بادشاہ ایں قصیدۂ مصنوع گفتہ بود (ترجمۂ واصفی)

چہ میکشی چو شتر آب و خاک حجرۂ تن — شتر بباد فتادہ بحجرہ آتش زن

چہ میکشی شتر و حجرہ بہر آتش و آب — چو میبرد شتر باد و خاک حجرۂ تن

چو میبرد شتر و حجرہ ات باتش باد — مگوی از شتر و آب و خاک حجرۂ تن

ترجمہ قاضی محمود الحسینی، فقیر بسبیل مزاح گفتہ بود

مہدی کہ در علوم ریاضی سر آمد ست — نیک ست در نجوم ولی ہیئتش بد ست

دوسرے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ نویں اور دسویں صدی ہجری میں اس تخلص کے چار شاعر اور بھی گذرے ہیں:

(۱) نثاری[۱] - محمد علی جلائر - پسر علی جلائر است و اطوار غریبہ داشت و ایں مطلع از وست:-

کسی ہرگز چو من بیغم ندیدست — چو من غمدیدہ ای غم ہم ندیدست

(۲) نثاری تونی[۲] - در جناباد متوطن بود، تحصیل علوم و کمالات بسیار نمودہ و در علم ہیأت و نجوم و از اقسام فنون و شعر و عروض واقف، شاعر با مان و از ارباب زادہای کلان است سر و نمرد در ہجر شاہ درویش از منظومات[۳] اوست و فاتش در حدود سنہ سبع و ستین و تسعمأتہ،

از اشعار اوست:

ای از تو گلرخاں را چوں لالہ داغ بر دل — پیشت سہی قداں را چوں سرو پائی در گل

[۱] مجالس ص ۲۴۴ [۲] نفائس. [۳] دیگ دیوان عقب گزاشت تحفۂ سامی. فٹ نوٹ

خوش آنکہ دل ز علائق بیک نگار دہد — ہزار تفرقہ را بر یکی قرار دہد

ولہ ز آب چشم از ینگو نہ گر حباب افتد — بساکہ پردۂ مردم بروی آب افتد

ر دل شبی چنگ در آں سلسلۂ پرخم زد — باد صبح آمد و ایں سلسلہ را برہم زد

(۳) نثاری تبریزی[۱] - قنادی بود، در ایام حکومت قاضی مسافر قصیدۂ ای در مدح او گفتہ و رعایتی از و نیافتہ، در ہجو قاضی گفت:

دل تنگ آمد مرا از نکتہ مدح اسلف — بعد ازیں ہجو تو میگویم خوشامد بر طرف

ہست دیوانخانہ و خلوت گہ خاتون تو — آں یکی دار المظالم ایں یکی بیت اللطف

بسبب وقوع ایں امر نثاری از تبریز بیروں آمد، چند آنکہ قاضی مذکور حاکم بود بتبریز نرفت چندانی نگذشت کہ قاضی را در صندوق کردند و از زجر و ایذای بسیار در قلعۃ الموت گوش و بینی برید بند کردند، مقید بود تا مرد، نثاری سلیقہ نیک داد، از اشعار اوست

خواہم آں گلگوں قبا تیغی بخون تر کند — کار من در عاشقی باشد کہ رنگی بر کند

ولہ سر راہی، پی نظارۂ ماہی دارم — کہ بر ہش راہ ندارم سر راہی دارم

ر تیر او کہ ز دل چاک من آید بیروں — بعد مردن مگر از خاک من آید بیروں

ر از نظر رفت مرا دیدہ بدیدار ہنوز — حیرت افزای من آں قامت رعنا ہنوز

ر چند سوزیت با دل پر درد و محنت بنگرم — بگذری با غیر و دنبالت بحسرت بنگرم

ر اندک استغنای او عشاق را دل خوں کند — گر بقدر حسن استغنا کند پس چوں کند[۲]

ر پیش آنمہ دید بر آئینہ روی و دختم — او ز رشک افروخت و من از تہ ساری سوختم

اس کے علاوہ ملا حیدری اور نثاری نے ایک دوسرے کی ناقابل تحریر فاحش ہجویں لکھیں جو دونوں کی بیحیائی اور بد مذاقی کا نمونہ اور نفائس المآثر میں موجود ہیں۔

(۴) نثاری قزوینی[۳] - خالی از طبعی نیست اوقات بکسب میگزراند ایں رباعی از وست

پیوستہ بدل بار غم یار کشم — وز دیدہ ہمہ منت دیدار کشم

جانم بلب آمد و تن از غم کاہید — اینہا ہمہ از دوری دلدار کشم

[۱] نفائس [۲] یہ شعر تذکرۂ احباب میں قاسم مرزا ابن کامران کی جانب منسوب ہے [۳] نفائس

ظہیر فاریابی

از جناب حکیم منظور الحسن صاحب برکاتی ٹونک

مکرم و محترم دام مجدکم ! سلام مسنون

آپ کے موقر رسالہ معارف کا مطالعہ ہر ماہ بڑی پابندی سے کرتا رہتا ہوں، اور اس میں جو علمی، تحقیقی اور تاریخی مضامین و مقالات شائع ہوتے ہیں ان کو نہ صرف دلچسپی و توجہ سے پڑھتا ہوں بلکہ ان سے استفادہ بھی کرتا رہتا ہوں،

پچھلے مہینوں، اپریل، جون اور جولائی کے شماروں میں "دیوان ظہیر اور اس کا مصنف" کے عنوان سے جو تحقیقی بحث صاحب مضمون جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب، صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی، اور جناب خواجہ عبد الرشید صاحب کے درمیان شائع ہوئی ہے، وہ تحقیق ہونے کے ساتھ ساتھ معلومات افزا اور قابل قدر بھی ہے،

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ فاضل مضمون نگار، اور ان کے مضمون پر جرح و تعدیل کرنے والے بزرگ دونوں ہی سے اس بحث کے سلسلے میں بعض اہم "تاریخی سہو" بھی ہو گئے ہیں۔

جن کی تصحیح کی جانب اس عریضہ کے ذریعہ آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، اور اس سلسلہ میں اپنی حقیر معلومات پیش کر رہا ہوں۔

اگر آں جناب میری معروضات سے متفق ہوں۔ اور مناسب خیال فرمائیں تو اس کو بھی معارف میں شائع فرما دیں۔ امید کہ جواب سے سرفراز فرمائیں گے،

(۱) ظہیر فاریابی، اپنے عہد کے باکمال، قادر الکلام و صاحب طرز اور مسلّم الثبوت شاعر تھے، جو حضرت انوری کے معاصرین میں ہیں، بلکہ اس پایہ کے شاعر ہیں کہ اکثر نقادان سخن نے ان کا اور انوری کا موازنہ و مقابلہ بھی کیا ہے، اور بعض نے تو انوری کے مقابلہ میں ان کو ترجیح بھی دی ہے، چنانچہ حضرت علامہ شبلی شعر العجم حصہ اول میں رقم طراز ہیں:-

"اباقان خاں کے زمانہ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ انوری اور ظہیر فاریابی دونوں میں کس کو ترجیح ہے، سب نے "مجد ہمگر" کو ثالث قرار دیا اور ایک منظوم استفتا لکھا۔" (ص ۲۲۷)

اس لیے یہ کہنا کہ "غزلیات کا ایک دیوان بھی ظہیر سے "منسوب" کر دیا گیا ہے۔" (معارف اپریل ص ۳۱۱) درست نہیں، ظہیر کی غزل گوئی کا ثبوت "مجد ہمگر" کے ان اشعار سے بھی ملتا ہے، جو اس نے مذکورہ بالا بحث کے سلسلہ میں بحیثیت حکم کے لکھے ہیں، جن میں ظہیر کے اشعار کو "در شاہوار" کہا ہے اور قصیدہ گوئی میں انوری کو ظہیر پر فضیلت دی ہے۔

البتہ یہ بات درست مانی جا سکتی ہے کہ ظہیر کے موجودہ مطبوعہ دیوان میں جو غزلیں ہیں ان میں بعض غزلیں یا اشعار، زبان و بیان، یا دوسرے تاریخی شواہد کے اعتبار سے ظہیر فاریابی کے نہیں ہو سکتے"

لیکن اس سے یہ قیاس کرنا کہ ظہیر فاریابی سرے سے غزل کے شاعر ہی نہ تھے، اور ان سے غزلیات یادگار ہی نہیں ہیں، انصاف کے خلاف ہے۔

اسی طرح یہ نتیجہ بھی اپنے صغریٰ و کبریٰ کے اعتبار سے صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ

"اگر خواجہ صاحب کے خیال کے مطابق وہ اشعار ظہیر فاریابی کے سمجھ لیے جائیں تو پھر اس شاعر کی ایسی مقبولیت کا ثبوت چاہیے جس کی وجہ سے ان کتابوں کے مقدس مصنفین نے ظہیر فاریابی جیسے درباری قصیدہ نگار کی تراکیب اپنی کتابوں کے لیے پسند کی ہوں۔"

(معارف جولائی)

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے، ظہیر فاریابی کی مقبولیت کا ثبوت تو تمام تاریخی کتابوں میں موجود ہے، اس لیے بعد کے شعرا کا ظہیر کی تقلید کرنا یا ان کی "تراکیب" کا استعمال کرنا کوئی ہلکی بات نہیں ہے۔

(۲) ظہیر فاریابی کا دیوان پہلی مرتبہ بھی مطبع نول کشور ہی سے شائع ہوا ہے، اس کا سنہ طباعت ۱۸۸۴ء ہے، اس وقت یہ مطبع لکھنؤ کے بجائے کانپور میں تھا، منشی نول کشور نے اس دیوان کے حاصل کرنے میں بڑی جد و جہد اور سعی بلیغ کی تھی، اور وہ اس کی دستیابی اور اپنی اس کامیابی پر بہت نازاں اور مسرور تھے، چنانچہ دیوان کے اختتام پر جو عبارت خاتمۂ طبع کے طور پر خواجہ محمد یحییٰ حیا کے قلم سے لکھی گئی ہے، وہ یہ ہے:۔

"ظہیر زمین و آسمان راستایش نصیر ہمگین امتنان اثنایش صلی اللہ علیٰ خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین، الی یوم الدین، اما بعد، پوشیدہ مباد کہ از بد و علو ایں کارخانہ لطافت نشانہ جناب مستطاب نامی و گرامی جمہور نول کشور دام اقبالہ و دام اجلالہ تائیدات سبحانات غیبی لاریبی، بہر حال کفیل آمال است نظر بایں دریں ہنگام فرخی فرجام یک نسخہ متبرکہ دیوان حق تبیان حکیم ظہیر فاریابی کہ در دستیابی حکم کیمیا بل عنقا داشت بعین توجہ موجہ جناب فضائل مآب عمدۂ عمدگان، زبدۂ زبدگان محمد افضل خاں نبیرۂ افضل وظیرہ جناب جلائل ایاب نواب محمد سرفراز خاں رئیس با عظم و شان ڈیرہ اسمٰعیل خان بجاریت بہر سید، نقل کالاصل این نسخہ مندرجہ بخط پاکیزہ و کاغذ عمدہ بصحت حسب وسعت بماہ جون ۱۸۸۴ء دریں مطبع فیض منبع واقع دار السرور کانپور منطبع گردید، منہ وکرمہ۔" (ص ۱۲۸)

اس اشاعت کا ایک نسخہ ٹونک کے قدیم تاریخی کتب خانہ "سعیدیہ ڈسٹرکٹ لائبریری

میں موجود ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ظہیر فاریابی کے دیوان کے تین ایڈیشن نکلے

پہلا ۱۸۸۴ء در مطبع نولکشور کانپور (جس کی ایک کاپی کتب خانہ ٹونک میں ہے)

دوسرا ۱۸۹۰ء 〃 لکھنؤ (جس کا حوالہ خواجہ صاحب نے دیا ہے)

تیسرا ۱۹۱۶ء 〃 〃 (جس کا تذکرہ ڈاکٹر صاحب کے مضمون میں ہے)

مطبع نول کشور کو دیوان ظہیر سے پہلے "قصائد ظہیر" کی اشاعت کا بھی فخر حاصل ہے، جو سنہ ۱۸۸۰ء میں پہلی بار شائع ہوئے۔

۳۔ ڈاکٹر غلام مصطفٰے صاحب نے ظہیر کا سنہ وفات ۵۹۸ھ/۱۲۰۱ تحریر کیا ہے جس کی تردید خواجہ عبدالرشید صاحب نے کی ہے، اور بحوالہ دیوان ظہیر لکھا ہے کہ

"سال وفات ایں سخن در یکتائے روزگار ۵۵۸ھ بود۔"

اس سلسلے میں عرض ہے کہ ظہیر کا سنہ وفات مندرجہ ذیل شہادتوں کی بنا پر ۵۹۸ھ ہی صحیح ہے، ۵۵۸ھ غلط ہے:

الف۔ کتب خانۂ سعیدیہ ٹونک میں خدابخش لائبریری پٹنہ کی ایک مطبوعہ فہرست "محبوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب" کے نام سے ہے، جو خود مولوی خدابخش صاحب مرحوم کی مرتب کردہ ہے، اس فہرست کے صفحہ ۵۶۶ پر "قصائد ظہیر فاریابی" کے تعارف و تبصرہ کے ذیل میں تحریر ہے کہ

"وفات ظہیر در ۵۹۸ھ واقع شد، مرقدش در سرخاب تبریز بود۔"

ب۔ سلطان قزل ارسلان، ظہیر کا ممدوح ہے، ظہیر نے اس کی مدح میں کئی بلند پایہ قصیدے کہے ہیں، اور قزل ارسلان ۵۸۲ھ میں مسند نشین ہوا ہے

پروفیسر محمود شیروانی مرحوم تنقید شعر العجم میں لکھتے ہیں:

"قزل ارسلان صرف پانچ سال یعنی ۵۸۲ھ سے ۵۸۷ھ تک حکومت کرتا ہے" (ص ۳۲۹)

قزل ارسلان کی مدح میں ظہیر کے قصائد کا ہونا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ظہیر ان سنین میں حیات تھا۔

ج۔ سلطان سنجر کے عہد حکومت میں سبعہ سیارہ کے برج میزان میں جمع ہونے اور اس پر انوری کی پیشین گوئی کے سلسلہ میں ایک طویل بحث چلی تھی، اس بحث و نزاع میں ظہیر نے بھی حصہ لیا تھا، اور

"ستاروں کا اجتماع بقول نزہت القلوب حمد اللہ متوفی ۷۸۱ھ اور بقول کامل ابن الاثیر ۲۹ جمادی الآخر ۵۸۲ھ کو ہوا ہے، ان میں پہلی تاریخ صحیح ہے۔"

(تنقید شعر العجم ص ۱۹۸)

طوفان کا ذکر اکثر معتبر تاریخوں میں ملتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قضیہ ان ایام میں بہت کچھ بحث و جدال اور مناظرات کا موجب ہوا ہے، اس بحث میں جیسا کہ پروفیسر براؤن نے ذکر کیا ہے ظہیر فاریابی نے سرگرمی سے حصہ لیا ہے" (ایضاً ص ۱۹۸)

قاموس المشاہیر مطبوعہ نظامی پریس بدایوں سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے، اس کا بیان ہے:

"ظہیر الدین فاریابی ...... طغرل ثالث سلجوقی اور اتابک قزل ارسلان کا زمانہ پایا تھا، تبریز میں ۱۲۰۱ء مطابق ۵۹۸ھ میں وفات پائی۔"

غرض یہ سب تاریخی شہادتیں ظہیر فاریابی کے سنہ وفات ۵۹۸ھ ہی کو ثابت کرتی ہیں۔

۴۔ مخزن الاسرار نظامی کے سنہ تصنیف اور مولانا نظامی کے سنہ وفات کی تعیین میں ڈاکٹر صاحب اور خواجہ صاحب دونوں ہی سے "سہو" ہوا ہے، ڈاکٹر مصطفیٰ صاحب نے

مخزن کا سنہ تصنیف، اور مولانا نظامی کا سنہ وفات ۵۹۹ھ قرار دیا ہے، اور خواجہ عبدالرشید صاحب نے بحوالہ تذکرہ میخانہ ۵۵۰ھ سنہ تصنیف تحریر کیا ہے، حالانکہ نہ یہ صحیح ہے اور نہ وہ، بلکہ مخزن الاسرار بقول علامہ شبلی ۵۵۹ھ (شعر العجم جلد اول ص ۲۹۰) اور بقول پروفیسر محمود شیروانی ۵۷۲ھ (تنقید شعر العجم ص ۳۰۱) میں تصنیف ہوئی ہے۔

۵۔ مولانا نظامی کے سنہ وفات کے سلسلے میں پروفیسر محمود شیروانی رقم طراز ہیں:-

"بعض سکندر ناموں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ نظامی نہ صرف ساتویں صدی کے آغاز ہی میں موجود تھے، بلکہ اس کے پہلے عشر کا ایک معتد بہ حصہ کم از کم طے کر چکے تھے۔" (تنقید شعر العجم ص ۳۱۰)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

"اس کی (سکندر نامہ) کی آخری اشاعت اتابک نصرۃ الدین ابوبکر کی خدمت میں پیش کیجاتی ہے، اور ۶۰۷ھ میں اس کی وفات کے بعد نظامی اس کتاب کو نور الدین ارسلان شاہ کے نام منسوب کرتے ہیں۔" (تنقید شعر العجم ص ۳۲۹)

ضروری اعلان

معارف کے پاکستانی خریدار حسب ذیل پتہ پر سالانہ قیمت ساڑھے آٹھ روپے (۸/۸) جمع کر کے اس کی رسید دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ بھیجدیں تو ان کے نام سے رسالہ جاری کر دیا جائیگا

جناب سید سخی احمد ہاشمی صاحب لکچرار اردو

سندھ یونیورسٹی

حیدرآباد

(مغربی پاکستان)

دو نایاب تحریریں

(استدراک)

از جناب محمد بشیر الحق صاحب دسنوی عظیم آبادی

جولائی ۱۹۶۲ء کے معارف (ص ۵۵) میں جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کا استدراک نظر نواز ہوا، صاحب موصوف کے استدراک میں تصحیح کی ضرورت ہے،

معلوم نہیں جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی نے یہ کہاں سے لکھدیا کہ حیات الحسن صاحب کے ترجمے کی پہلی جلد منشی انشاء اللہ مدیر وکیل امرتسر نے غالباً ۱۹۰۱ء میں یا کچھ بعد شائع کر دی تھی، منشی انشاء اللہ خاں اخبار وکیل امرتسر کے مدیر نہیں تھے بلکہ اخبار وطن کے مدیر تھے جو لاہور سے نکلتا تھا،

پیرزادہ محمد حسین صاحب جج نے جو ترجمہ کیا تھا اس کا نام عجائب الاسفار یعنی شیخ ابن بطوطہ کا سفرنامہ جلد دوم ہے، یہ ۱۸۹۸ء میں دارالاشاعت پنجاب کی طرف سے مولوی سید ممتاز علی صاحب کے مطبع رفاہ عام لاہور میں چھپ کر شائع ہوا تھا، بڑی خوبی اس کتاب کی یہ ہے کہ مترجم کے حواشی سے بھری ہوئی ہے، کتاب کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ کارآمد اور بہت سی مفید حواشی کی نذر ہو گیا ہے، پوری کتاب بڑی تقطیع کے ۵۰۰ صفحوں میں ہے، اور کتاب کے آخر میں دس صفحوں میں انگریزی میں انٹروڈکشن (Introduction

یہ کتاب بزا مترجم نے اپنے استاذ G. W. Lietner, M.A Ph. D. L.L. D. Do.L وغیرہ وغیرہ کے نام Dedicate کی ہے۔

اسی سلسلے کی ایک اور کتاب ہے جس کا نام:

خلاصۂ تحفۃ النظار

یعنی

سفرنامۂ شیخ ابن بطوطہ

از

جناب مولوی عبدالرحمن خاں صاحب، صدر حیدرآباد اکیڈمی

مع تنقید و مختصر تاریخی تبصرہ

مطبوعہ جید پریس دہلی ۱۹۴۸ء

اس کتاب کو مکتبۂ برہان جامع مسجد دہلی نے شائع کیا ہے، کتاب چھوٹی تقطیع کے ۲۴۰ صفحوں میں چھپی ہوئی ہے،

تینوں مذکورہ بالا کتابیں خدابخش اورنٹیل پبلک لائبریری کے الاصلاح لائبریری دیسنہ سکشن میں محفوظ ہیں۔

ادبیات

غزل

از جناب کریم الرضا خاں صاحب وکیل شاہجہانپور

دل کو ہزار ہو سکوں درد کی بات اور ہے ۔ جو غمِ یار میں کٹے رات وہ رات اور ہے

شکوۂ جورِ آسماں یونہی زباں پہ آگیا ۔ آپ برا نہ مانیے آپ کی بات اور ہے

اُسکی نگاہِ دلفریب وجہ سکوں سہی مگر ۔ دل کو تلاش جس کی ہے وہ کوئی بات اور ہے

ناصحِ کم نگاہ سے کہتا ہے شوقِ پردہ در ۔ جلوۂ ذات اور ہے ذکرِ صفات اور ہے

شوقِ طلب ہے زندگی بندۂ زندگی نہ بن ۔ قیدِ حیات اور ہے ذوقِ حیات اور ہے

لاکھ حجاب ہوں مگر لطف تصوراتِ حسن ۔ عشق کے دل سے پوچھیے عقل کی بات اور ہے

عقل اسیرِ چار سو عشق محیطِ کائنات
عشق کا حکم اور ہے عقل کی بات اور ہے

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

رقصاں تمام عالمِ ہستی نظر میں ہے ۔ میں کیا سفر میں ہوں کہ زمانہ سفر میں ہے

لطفِ مآلِ عشق و محبت نظر میں ہے ۔ اک کیفِ مستقل مرے قلب و جگر میں ہے

وہ دن گئے کہ ہنستے تھے رونے پہ وہ مرے ۔ اب دل کی شان اور ہی انکی نظر میں ہے

چھٹتا ہے آدمی سے جہاں زندگی کا ساتھ ۔ ایسا بھی اک مقام تری رہگذر میں ہے

عالم میں انقلاب ہزاروں بپا ہوئے ۔ لیکن وہی اثر مری شام و سحر میں ہے

جوہر قفس میں نکہتِ گل طعنہ زن نہ ہو
اڑنے کی تاب ورنہ ابھی بال و پر میں ہے

غزل

از جناب ساجد اٹیٹھوی

راتوں کی تابشوں میں نہ حسنِ سحر میں ہے ۔ جادو ترے جمال کا میری نظر میں ہے

آنکھوں میں اشکِ غم تری صورت نظر میں ہے ۔ اے ناخدا سنبھال سفینہ بھنور میں ہے

پھولوں کو بل نہ پائی جو چاکِ جگر میں ہے ۔ ساری بہارِ حسن چمن آج میرے گھر میں ہے

دیکھیں تو ٹوٹتا ہے کہاں اب طلسمِ شوق ۔ منزل سے دور رہرو منزل سفر میں ہے

لٹتے جہاں ہیں آرزوئے دل کے قافلے ۔ ایسا بھی اک مقام تری رہگذر میں ہے

ہم دل جلوں کی آہ کے اثرات دیکھنا ۔ ہنگامہ بجلیوں میں قیامت شرر میں ہے

ٹکرا کے دار سے بھی نہ تیور بدل سکے ۔ وہ عزمِ غم شکن ترے آشفتہ سر میں ہے

کیا بات ہے شبابِ تمنا کی عشق میں ۔ جلوے میں جو نہیں ہے وہ جلوہ نگر میں ہے

ساجد اب اس سے بڑھ کر بھی کیا آرزو کروں
سب کچھ تو میری زندگیِ مختصر میں ہے

مطبوعات جدیدہ

العبر فی خبر من غبر حصہ اول } از امام ذہبی صفحات ۵۰۸، ٹائپ اعلیٰ، ناشر: دائرۃ المطبوعات والنشر، کویت، قیمت درج نہیں۔

امام ذہبی اُن اساطین امت میں ہیں جنھوں نے علم حدیث و تاریخ میں ایسی بیش قیمت تصانیف چھوڑی ہیں جن سے دنیائے اسلام کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتی، انہی کتابوں میں العبر بھی ہے، انھوں نے تاریخ پر تین کتابیں لکھی ہیں، ان میں سب سے ضخیم و مفصل "تاریخ اسلام ہے" جو ۱۲ جلدوں میں مکمل ہوئی تھی، اس کی تصنیف سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے دو مختصر تاریخیں لکھیں، جن میں ایک کا نام دول الاسلام، دوسری کا نام العبر فی خبر من غبر ہے، ان کی تاریخ اسلام تو غالباً اب تک شائع نہیں ہو سکی ہے، البتہ دونوں مختصر تاریخیں چھپ گئی ہیں، دول الاسلام دائرۃ المعارف حیدرآباد سے عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے اور العبر کی طباعت کویت کے نئے علمی ادارہ دائرۃ المطبوعات کی طرف سے ہوئی۔ دول الاسلام کی ابتدا حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت سے کی ہے اور العبر کی ابتدا پہلی ہجری سے، اس کتاب کی دو جلدیں ہیں، پہلی جلد چھپ کر بازار میں آگئی ہے اور دوسری زیر طبع ہے، یہ کتاب فن تاریخ پر ان کی ماہرانہ بصیرت کی شاہد عادل ہے، انھوں نے ایک ذمہ دار مورخ کی حیثیت سے واقعات کے نقل کرنے میں کسی طرح کی کتر بیونت نہیں کی ہے، اپنے جذبات اور رائے کا اظہار ضرور کیا ہے، مگر نقل واقعات کے بعد اور پورے توازن کے ساتھ اس میں انھوں نے جن حقائق کی طرف چند جملوں میں اشارے کر دیے ہیں وہ بعض طویل تاریخوں سے بھی واضح نہیں ہوتے،

مثلاً وہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے دور خلافت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: حتی کاد تجتمع الامۃ علیہ اس جملہ میں اس دور کی ایک پوری تاریخ بھی پوشیدہ ہے اور انھوں نے بڑے متوازن انداز میں اپنے جذبات کا اظہار بھی کر دیا ہے، اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں یلوم اباہ علی القیام فی الفتنۃ ویطیعہ (ص ۷۳) اسی طرح عبدالملک بن مروان کے عہد میں مسلمانوں پر رومیوں کی تاراج کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس نے رومیوں کے حملوں سے بچنے کے لیے اس شرط پر صلح کر لی کہ ہر جمعہ کو وہ ایک ہزار دینار رومیوں کو بطور تحفہ پیش کرے گا، اس صلح کا ذکر کر کے پھر ایک اسلامی مورخ کی حیثیت سے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں: ھذا اول وھن دخل علی الاسلام وما ذاک الا الاختلاف الکلمۃ وبکون الوقت فیہ خلیفتان تنازعان الا انما شاء اللہ کان (ص ۷)، اس جملہ سے کتنے شدید تاثر کا اظہار ہوتا ہے، مگر ایک مورخ کے منصب سے ذرا بھی ہٹے نہیں ہیں، دوسری صدی کے مشہور مفسر ضحاک بن مزاحم کے تذکرہ میں ایک ایسے عظیم مدرسہ کا ذکر کیا ہے کہ جس میں تین ہزار لڑکے تعلیم پاتے تھے، کان فقیہ مکتب عظیم فیہ ثلاثۃ آلاف صبی۔ (ص ۱۲۴)

اس طرح سیکڑوں شذرات الذہب اس کتاب میں بکھرے ہوئے ہیں، یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر پڑھا لکھا اسے ایک اسلامی تاریخی ڈائری کے طور پر اپنے ساتھ رکھے، حکومت کویت اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد کی مستحق ہے،

نظر گاہ - از جناب اختر موہانی، صفحات ۱۶۰، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر صدیق بک ڈپو، امین آباد لکھنؤ۔ قیمت :- عہ

سید محمد حسن اختر موہانی کا شمار اساتذۂ فن میں ہوتا ہے، ان کا پہلا مجموعہ "فردوس معانی" آج سے ۳۰ - ۴۰ برس پہلے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے، اس کے بعد ان کا دوسرا مجموعہ "ارمغان" شائع ہوا

اور اب ان کا تیسرا مجموعہ "نظرگاہ" نظر افروز ہوا ہے، اس مجموعہ میں تقریباً ڈیڑھ سو غزلیں ہیں، ان کے کلام کا ابھی اچھا خاصا حصہ اشاعت سے محروم ہے۔

افقرؔ صاحب دو واسطوں سے مومنؔ کے شاگرد ہیں، اس لیے ان کے کلام میں مومنؔ کا رنگ جھلکتا ہے، افقرؔ صاحب کا کلام اپنے معاصر شعراء اصغرؔ، فانیؔ، حسرتؔ، جگرؔ، فراقؔ وغیرہ سے کسی طرح کمتر نہیں ہے، بلکہ متانت و پاکیزگی میں اصغرؔ کے علاوہ ان کا کوئی مدمقابل نہیں ہے اور درد و سوز کے لحاظ سے وہ سب میں ممتاز ہیں، افقرؔ ایک صوفی شاعر ہیں اور ان کی شاعری تصوف کی تمام قدروں اور خصوصیت سے عشق و محبت کے جذبات سے لبریز ہے، یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ وہ اس دور کے خواجہ میر درد ہیں، خواجہ صاحب کے بارے میں تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ شاعری دون مرتبۂ اوست، اور افقرؔ نے بھی کہا ہے

نہیں شاعری حاصلِ زیست افقرؔ فراقؔ و جگرؔ ہو کے کیا کیجئے گا

ترقی پسندی کے اس دور میں ان کے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم رہ گیے ہیں، مگر اس کے باوجود یہ مجموعہ ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا۔

کلام غالب - از جناب جلیلؔ قدوائی، ایم اے، ٹائپ متوسط، صفحات ۱۰۶، ناشر ادارۂ نگارش و مطبوعات، کراچی ۱۸

غالب کا دیوان گو خود ہی انتخاب ہے، مگر اس کے باوجود اس کے متعدد منتخبات شائع ہو چکے ہیں، انتخاب کرنے والوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کا انتخاب کیا ہے، ان ہی میں کلام غالب بھی ہے جسے جلیل احمد صاحب نے جنھیں بچپن سے غالب اور ان کے کلام سے عشق ہے انتخاب کیا ہے، انتخاب کے بارے میں مصنف نے خود لکھا ہے کہ" اس انتخاب میں غالب کے وہ تمام اشعار جو خوش مذاق اہل علم و نقاد کی زبان پر ہیں یا وہ اس قابل ہیں کہ رہیں، اور جن پر غالب کی شہرت و عظمت کا مدار رہا ہے،

وہ سب کے سب شامل کر لیے گئے ہیں"، یہ دعویٰ بڑی حد تک اس لیے صحیح ہے کہ اس انتخاب میں دیوان کا تقریباً تین حصہ آ گیا ہے، غالبؔ کے قدر دانوں میں یہ انتخاب ضرور مقبول ہوگا۔

سچا دین حصۂ اول، دوم، سوم، چہارم - از افضل صاحب و یوسف صاحب اصلاحی، ناشر: مکتبہ جماعت اسلامی ہند، سوئی والان ۱۴۳۵ دہلی ۶

یہ چاروں رسالے ابتدائی درجات کے بچوں کے لیے اس غرض سے لکھے گئے ہیں کہ ان کے ذریعہ بچوں کو اسلامی عقائد و عبادات، اخلاق و معاملات اور سیرت نبویؐ اور سیرت صحابہؓ سے واقف کرا دیا جائے، اس سے پہلے ریاست حیدرآباد کے شعبۂ دینیات کی طرف سے اسی طرح کا ایک جامع سٹ دس حصوں میں شائع کیا گیا تھا، یہ رسالے گویا اسی کی تکمیل یا نقش ثانی ہیں، انداز بیان اچھا اور دلکش ہے، فقہی مسلک کے سلسلہ میں یہ احتیاط رکھی گئی ہے کہ بچے کے ذہن پر کسی ایک ہی مسلک کی چھاپ نہ پڑنے پائے، مگر اس احتیاط سے یہ خطرہ بھی ہے کہ کہیں بچوں کو طہارت اور نماز روزہ کی ضروری تفصیلات کا بھی علم نہ ہو سکے، قرآن مجید کی قرأت کے قاعدے کو پہلے حصے کے بجائے دوسرے تیسرے حصے میں ہونا چاہیے تھا، اگر عقائد و عبادات کی تفصیلات کے لیے ایک الگ رسالہ لکھا گیا ہوتا تو زیادہ مفید ہوتا،

اسلامی نظمیں، بدھو کی بیوی - از جناب محمد شفیع صاحب نیرؔ، ناشر مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ قیمت ۶۵ نئے پیسے اور ۳۰ نئے پیسے۔

یہ دونوں رسالے بچوں کے مشہور شاعر محمد شفیع صاحب نیر کی کاوش کا نتیجہ ہیں، وہ بچوں کے لیے نثر و نظم دونوں میں ہلکی پھلکی کتابیں لکھتے رہتے ہیں، انہی میں یہ دونوں کتابیں بھی ہیں، یہ بچوں کی نفسیات سے خوب واقف ہیں اس لیے ان کی لکھی ہوئی کتابیں بچے بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں، امید ہے کہ دوسری کتابوں کی طرح یہ دونوں کتابچے بھی مقبول ہوں گے۔

فلسفۂ دعا۔ از پروفیسر افضل احمد صاحب، عارف ایم اے، صفحات ۱۰۲، کتابت و طباعت بہتر، ناشر مکتبہ رشیدیہ، غلہ منڈی منٹگمری، ہندوستان: مکتبۂ علم و ادب دیوبند۔ قیمت للعہ

عبد و معبود کے رشتہ کو جو چیزیں جوڑتی ہیں ان میں ایک موثر جذبہ دعا بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ دعوت و تبلیغ کیساتھ تمام انبیاءؑ، اور خصوصیت سے سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت رہی ہے کہ انھوں نے سراء و ضراء نعمت و مصیبت ہر حال میں خدا ہی کو پکارا ہے، قرآن و حدیث میں جو دعائیں اگلے انبیاءؑ، اور ان کے حواریین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی زبان سے منقول ہیں، ان میں ایک طرف توحید کا اعلیٰ تصور، آخرت کا پرشور احساس اور خوف و رجا کی بہترین آمیزش ملے گی، دوسری طرف آپؐ کی زندگی کے ہر موقع و محل اور نازک سے نازک انسانی احساسات و جذبات کی ترجمانی ملے گی۔ تیسری طرف ان کے پڑھنے سے آپ کے ایمان میں روشنی اور قلب و دماغ میں جلا آئے گی اور سوز و گداز پیدا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعا سے اس سے زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا کہ ایک باپ یا ماں کا دل اپنے ننھے بچے کی فرمائش سے باغ باغ ہو جاتا ہے، جس کسی کو دعوت کے ساتھ دعا کی دولت بھی ہاتھ آجائے اس نے واقعی بڑی دولت پائی۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

پروفیسر افضل صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس موضوع پر ایک عمدہ کتاب لکھ دی، یہ کتاب بار بار زبان دل اور چشم پرنم کے ساتھ پڑھنے کے لائق ہے۔

م، ج

جلد ۹۰ ماہ جمادی الاول سنہ ۱۳۸۲ء مطابق ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۲ء عدد ۴

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۲۴۲ - ۲۴۴

مقالات

ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر	جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم، اے۔	۲۴۵ - ۲۶۸
کچھ مظہر کے بارے میں	جناب پروفیسر سید حسن صاحب پٹنہ	۲۶۹ - ۲۸۳
خیام کا قدیم ترین تذکرہ	جناب شبیر احمد خانصاحب غوری ایم اے رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش	۲۸۴ - ۲۹۵
المسعودی	جناب مولوی شبیر عطا صاحب ندوی	۲۹۶ - ۳۰۷

ادبیات

حقایق و معارف	جناب افقر موہانی	۳۰۸
غزل	جناب تسکین قریشی	۳۰۹
"	جناب اختر مسلمی اعظمی	

باب التقریظ والانتقاد

رسائل و اخبارات کے خاص نمبر	ض	۳۱۰ - ۳۱۶
مطبوعات جدیدہ	م - ج	۳۱۷ - ۳۲۰